اپریل 2018
www.shibliinternational.com

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad

ایڈیٹر ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

10/- روپے

اپریل ۲۰۱۸ء

علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی، سماجی اور معلوماتی شاہکار

جلد:۴۔شمارہ:۳

ماہنامہ

صدائے شبلی

حیدرآباد

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری، ڈاکٹر عبدالقدوس، ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، پروفیسر مظفر علی شہ میری

حضرت رحمٰن جامی، پروفیسر محسن عثمانی ندوی پروفیسر ابوالکلام

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی

مولانا ارشاد الحق مدنی، مولانا محمد مساعد ہلال احیائی

اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ، محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال

ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو

ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین

ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان

ابوہریرہ (اینکر ای ٹی وی) محسن خان

MOHD MUHAMID HILAL
A/c: 52023475202
Ifsc: SBIN0020413
Micr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd

قیمت فی شمارہ: 10

سالانہ: 120 - بیرونی ممالک:50/امریکی ڈالر

خصوصی تعاون:1000

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں ہے

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اداریہ	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	5
۲	نعت شریف	پروفیسر مظفر علی شہ میری	6
۳	خلفائے راشدین کے دور میں قضا کا انتظام	مولانا نجم الدین احیائیؔ	6
۴	خواجہ اجمیریؒ — نمونۂ دعوت دین	ڈاکٹر محمد رفیق	11
۵	منفرد لب ولہجہ کا شاعر ناصر کاظمی	ڈاکٹر سمیہ تمکین	14
۶	اردو صحافت کا ماضی اور حال	ابو ہریرہ یوسفی	18
۷	غزل	نذیر نادر	21
۸	اسناد کی اہمیت	ڈاکٹر غوثیہ بانو	22
۹	'نالۂ شب گیر': احتجاج کا نیا انداز	ڈاکٹر سراج احمد انصاری	25
۱۰	سازشی تھیوری اور مسلمان	ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ	30
۱۱	شیخ الاسلام محمد انوار اللہ فاروقیؒ بانی جامعہ نظامیہ	آمتہ الصبیحہ (فاضلہ)	34
۱۲	شہر آشوب اسلام	علامہ شبلی نعمانی	35
۱۳	غزل	ڈاکٹر عبدالحنان رہبرؔ	36
۱۴	غزل	جہانگیر قیاس	36
۱۵	آئی پی ایل: کرکٹ، دولت اور شہرت کا سنگم	ابو ہریرہ (ای ٹی وی)	37
۱۶	شبلی کی صدا آفاقی ہے، جس میں قوم وملت کی دردمندی ٹپکتی ہے:	ادارہ	39
۱۷	(تبصرہ) ''منظور الامین۔ نباض فکر وفن''	ڈاکٹر سمیہ تمکین	41

☆☆☆

اداریہ

مسبب الاسباب کے خاص فضل وکرم سے ہم صدائے شبلی کا دوسرا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کررہے ہیں۔ پہلے شمارے کی رسم اجرا ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کرنول آندھراپردیش میں زیرسرپرستی حضرت رحمٰن جامؔی، مہمان خصوصی پروفیسر سید خطیب مصطفیٰ، ڈاکٹر شاہدہ اختر، ڈاکٹر مختار احمد فردین، اساتذہ، طلباء وطالبات کی موجودگی میں عزت مآب وائس چانسلر استاذ محترم پروفیسر مظفر علی شہ میرؔی کے ہاتھوں ہوئی۔ ہم ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کے تمام اساتذہ، عملہ طلباء اور طالبات بالخصوص وائس چانسلر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے اس اہم کام میں حوصلہ افزائی کی اور مستقبل کے لئے کہا کہ میرا تعاون آپ لوگوں کے ساتھ ہمیشہ رہے گا۔ (جزاک اللہ احسن الجزاء طول العمرہ وزیدہ مجدکم)

رسم اجرا کے خبر کی سرخی روزنامہ منصف، اعتماد، رہنمائے دکن، صحافی دکن، راشٹریہ سہارا، تاثیر پٹنہ، جلیس بھارت وغیرہ نے اس طرح لگائی کہ ''شبلی کی صدا آفاقی ہے، جس سے قوم وملت کی دردمندی ٹپکتی ہے''۔ ہم سبھی ایڈیٹران کے سپاس گزار ہیں کہ انہوں نے ہماری خبر کو اہمیت دی۔ رسم اجرا کے بعد ملک اور بیرون ملک سے موبائل اور سوشل میڈیا کے ذریعہ مبارکبادیوں کا پیغام تسلسل سے جاری ہے اور ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کی ممبری میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے، ہم ان تمام خیرخواہوں کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ان کا تعاون آئندہ بھی جاری رہے گا۔

ملک شام کے کئی شہروں کی موجودہ صورت حال بالخصوص شہر غوطہ کی سنگین ہے، اسے دیکھ کر کلیجہ منہ کو آرہا ہے، دردمند انسانوں کے دل ودماغ پر مفلوجیت جیسی کیفیت چھائی ہوئی ہے، ظالم شکاریوں نے خدائی قانون اور انسانی ضابطے کی ساری دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں، ہرے بھرے باغات، فلک بوس عمارتیں بارود کے ڈھیر سے کھنڈر میں تبدیل ہوگئیں ہیں، لاکھوں نفوس، بچے، بوڑھے، جوان مرد اور عورتیں چیخ چیخ کر خونی آنسوؤں کے ساتھ سارے حکمرانوں سے فریاد کررہی ہیں، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ معدودے چند کے کہ سارے انسانوں کے جسم میں یا تو خون خشک ہوگیا ہے یا ان کے جسموں میں خون پانی بن گیا ہے۔ شبلی کی زبان میں یہ لڑائیوں کا دھواں کب تک اٹھتا رہے گا؟ لوگ کب تک ظلم کو دیکھتے رہیں گے؟ کب انسانیت جاگے گی؟ غیروں کو چھوڑیئے اپنے کب مظلوموں کی مدد کے لیے کھڑے ہوں گے؟ **فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا.**

پوری دنیا میں شکاریوں کے مختلف چہرے ہیں مگر ان کا شکار ایک ہی ہے، یعنی مسلمان۔ اس کا قصور یہ ہے کہ وہ دنیا میں امن وسلامتی کا ایک مستحکم پیغام رکھتا ہے، کاش کہ وہ لوگ تشدد اور تعصب کی عینک کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دیکھتے تو دنیا کا منظر نامہ کچھ اور ہی ہوتا، اور شکار بھی اپنے بچاؤ کے لئے عملی طور پر اپنی مدد آپ کرلیتا تو یہ ذلت کے دن دیکھنے نہ پڑتے ۔ ''تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں''

ہمارا ہندستان عالم میں قدیم زمانے سے مختلف احوال میں ایک عمدہ گنگا جمنی تہذیب کا حامل ہے مگر اقتدار کی ہوس اور روپئے کی لالچ نے اکثر وبیشتر لوگوں کو اس حال میں پہنچادیا ہے جس کو جو کام کرنا چاہئے وہ نہیں کررہے ہیں اور جو کرنا چاہئے اسے نظرانداز کررہے ہیں اور یہ بھی المیہ ہے کہ جس کو جہاں پہ ہونا چاہئے وہ وہاں پر نہیں ہے اور جس کو جہاں پر نہیں ہونا چاہئے وہ اپنی نااہلی کے ساتھ اس عہدے پر براجمان ہے، جس کی وجہ سے ملک میں افراتفری، نفرت رشوت وغیرہ کا بازار گرم ہے۔ عدلیہ کو چاہئے کہ عدل سے، مقنّنہ کو چاہئے کہ قانون سے، انتظامیہ کو چاہئے کہ اصول وضوابط سے اور میڈیا کو چاہئے کہ سچی اور ایماندارانہ صحافت سلیقہ سے کریں تاکہ ہمارے ملک میں امن وسلامتی اور خوشحالی کی فضا قائم ہو۔

معزز قارئین اس رسالہ کے مشمولہ مضامین پر اپنی آراء سے ہمیں ضرور بذریعہ خط نوازیں۔ ان شاءاللہ آپ کے خطوط آئندہ رسالے میں شائع کیے جائیں گے۔ نیز رسالے کی ممبرسازی میں ہمارا بھرپور تعاون فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں، نوازش ہوگی۔ قلم کاروں سے درخواست ہے کہ اپنے غیرمطبوعہ مضامین ان پیج فائل میں sadaeshibli@gmail.com پر ارسال کریں۔ شکریہ

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

پروفیسر مظفر علی شہ میری
وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کرنول (آندھراپردیش)

نعت شریف

یہی رضوانِ جنت نے سدا سب کو بتایا ہے
''مدینہ جس کو کہتے ہیں وہ جنت سے بھی پیارا ہے''

گوارا یہ نہیں ہے لوٹ آجاؤں میں طائف سے
مرا سارا بدن ہوجائے چھلنی، یہ گوارا ہے

اگر ذکرِ محمدؐ کی حلاوت سے رہیں عاری
ہمارا دن نمائش ہے، ہماری شب تماشا ہے

میں گردابِ جہاں میں غرق تھا برسوں مگر اک دن
کھلی جو آنکھ تو دیکھا کہ طیبہ کا کنارا ہے

امینِ باصفا کوئی نہیں تھا روزِ اول سے
خدا نے اس لیے ہی آپ پر قرآں اتارا ہے

کسی بھی زاویے سے دیکھیے ہوجائے گا ثابت
مدینہ اصل میں کونین کا دارالخلافہ ہے

بکھرتے جارہے ہیں ہم مظفر پوچھتے کیا ہو
مدینے کے نظاروں نے بہت ہم کو رلایا ہے

مولانانجم الدین احیائی

خلفائے راشدین کے دور میں قضا کا انتظام

اہل عرب دور جہالت میں حضارت وتمدن سے بالکل ناآشنا تھے۔اس لئے عموماان کے فیصلے نوک زبان کے بجائے نوک سنان سے ہوتے تھے مگر کبھی تلوار اٹھانا ان کے لئے مشکل ہوتا تو وہ اپنے قضایا قاضیوں سے فیصل بھی کرواتے،جن کو وہ عارفین(۱) کہتے تھے،مگر ایسے فیصلوں کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔

اسلام آیا اس نے جس طرح ان کی زندگی کے اور شعبوں کو بدلا اسی طرح اس شعبہ میں بھی کافی تبدیلی پیدا کی چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے اور مسلمانوں کی تعداد دن بدن بڑھنے لگی،جس کے نتیجہ میں ان میں کچھ اختلافی معاملات پیش آئے تو ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنے معاملات کسی شخص کے روبرو لے جائیں،ان کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مناسب اور لائق کون مل سکتا تھا،چنانچہ وہ اپنے معاملات آنحضورؐ کے سامنے لے جانے لگے۔حدیث وسیر کی کتابوں میں ایسے بہترے واقعات مذکور ہیں۔مثلاً کندہ اور حضرموت سے دو شخص آئے۔حضرمی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی علیہ وسلم اس شخص نے میری زمین غصب کرلی۔کندی نے عرض کیا حضرت یہ میری زمین ہے اور میرے قبضے میں ہے اس کا اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔آپ نے حضرمی سے فرمایا کہ تمہارے پاس دلیل ہے عرض کیا نہیں فرمایا تمہارے لئے قسم ہے دوسرے نے عرض کیا حضرت یہ فاجر ہے اس میں کچھ بھی تقوی نہیں فرمایا اچھا نہیں تو تم قسم کھاؤ وہ قسم کھانے کے لئے چلا آن حضورؐ نے فرمایا اگر جھوٹی قسم کھالی تو یہ ظلم ہوگا اللہ تعالی قیامت کے دن اس سے منہ پھیر لے گا۔(۲)

صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی غیر مسلم بھی اپنے

معاملات لے کر آتے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ یہود آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے دو زانیوں کا مقدمہ پیش کیا آن حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ تم توریت میں کیا سزا پاتے ہو عرض کیا زنا کار کی سزا رسوائی اور کوڑے۔ حضرت عبداللہ ابن سلام موجود تھے فرمایا تم جھوٹ کہتے ہو تورات میں رجم ہے وہ لوگ تورات لائے اور آیت رجم پر ہاتھ رکھ کر سیاق وسباق پڑھنے لگے حضرت عبداللہ ابن سلام نے کہا ہاتھ اٹھاؤ ہاتھ اٹھایا تو آیت رجم موجود تھی جس کے نتیجہ میں دونوں رجم کئے گئے۔(۳)

آنحضورؐ نے ان فیصلوں کے درمیان ایسے اصول بتا گئے جو آپ کے بعد خلفائے راشدین کی سچی رہنمائی کرتے رہے خلفاء نے ہمیشہ اس کی پیروی کی بذات خود آنحضورؐ نے بھی ان اصولوں کو اپنانے کی ترغیب دی تھی۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو آپ نے یمن کی طرف بھیجنے کا ارادہ کیا تو فرمایا کہ تم فیصلے کیسے کروگے۔ عرض کیا کتاب اللہ سے، فرمایا اگر کتاب اللہ نہ پاؤ؟ عرض کیا رسول اللہؐ کی سنت سے فرمایا اگر اس میں بھی نہ پاؤ؟ عرض کیا میں اجتہاد کروں گا اور ٹھیک فیصلے تک پہنچنے میں کوتاہی نہ کروں گا۔ آنحضورؐ نے (خوشی سے) معاذؓ کے سینہ پر مارا اور فرمایا:

الحمد لله الذی وفق رسول الله صلی الله علیه وسلم لمایرضی به رسول الله صلی الله علیه وسلم

اس خدا کا شکر ہے جس نے رسول اللہؐ کے رسول کو ایسے امر کی توفیق دی جس سے رسول اللہ راضی ہیں۔

خلفائے راشدین نے ہمیشہ یہ اصول پیش نظر رکھا اور قضاۃ کو خاص طور سے اس کی اجازت دیتے رہے حضرت عمر فاروقؓ نے قاضی شریح کو ایک فرمان میں لکھا کہ مقدمات اول قرآن مجید کے مطابق فیصل کرو، قرآن مجید میں وہ صورت مذکور نہ ہو تو حدیث اور حدیث نہ ہو تو اجماع (کثرت رائے) کے مطابق اور کہیں پتہ نہ لگے تو خود اجتہاد کرو۔(۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اگر کوئی شخصیت سب سے زیادہ بااثر تھی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت تھی۔ مسلمان اپنے معاملات بھی فیصلہ کرانے کے لئے انہیں کے پاس آتے مگر ان کے دور میں قضا کا کوئی مستقل انتظام نہ ہوسکا اس کے دو سبب ہیں۔

(۱)۔ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر جونہی خلافت کا بار پڑا عرب کے مختلف گوشوں میں فتنہ وفساد کے شعلے بھڑکنے لگے ایک طرف مدعیان نبوت اور مرتدین نے عرب کو کذب وافترا سے بھر دیا اور دوسری طرف مانعین زکوٰۃ نے زکوٰۃ نہ دے کر اسلام کے ایک اہم رکن کو بے حیثیت کرنا چاہا اس لیے ضرورت تھی کہ پوری قوت انہیں فتنوں کے دبانے میں لگائی جائے چنانچہ ابوبکرؓ نے ایسا ہی کیا اور اسی میں مشغول رہے اور فتنوں کے دبانے کے بعد اتنا وقت ان کو نہیں ملا کہ کسی نئے کام کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ ان کی خلافت کی کل مدت صرف دو سال تین ماہ اور دس راتیں تھیں۔(۷)

(۲)۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں جو روح پھونکی تھی وہ فطرت انسانی کے ہم آہنگ تھی اور جو لوگ اسلام لائے تھے ان کی طبیعتیں انتہائی سچی اور سلجھی ہوئی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے دور مبارک میں بھی زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی تھی جو تعداد کے اعتبار سے بہت کم تھے جس کی وجہ سے اختلافات کم ہوتے تھے دوسرے اسلامی حکومت کے حدود ابھی بہت محدود تھے جس کی وجہ سے ابھی ضرورت نہیں تھی کہ قضا کے لئے باقاعدہ انتظام کیا جائے۔

دورِ فاروقی میں داخلی فتنے تقریباً سب کے سب فرد ہو چکے تھے اگر ان کے کچھ اثرات تھے تو وہ بھی چند مہینوں میں ختم ہوگئے دوسری طرف مسلمانوں کی تعداد بہت ہی تیزی سے بڑھنے لگی اور غیر مسلم اسلام کے دامن میں کثرت سے پناہ لینے لگے تیسری طرف اسلامی حکومت کے حدود تقریباً دوگنے ہوگئے جس کے نتیجہ میں معاملات اور اختلافات کی تعداد زیادہ ہوگئی، جسے دیکھ کر حضرت عمرؓ نے ضرورت محسوس کی کوئی ایسا محکمہ قائم کیا جائے کہ جس کا تعلق انتظامیہ سے الگ ہو اور وہ خود ایک مستقل محکمہ ہو۔ چنانچہ

حضرت عمرؓ ہی کی وہ ذات گرامی ہے جس نے قضا کا باقاعدہ انتظام کیا اس محکمہ کا قیام ان کی اولیات میں داخل ہے۔(۸)

چنانچہ آپ نے مختلف شہروں اور صوبوں میں قاضیوں کو متعین کیا ان کا تعین بڑے غور وفکر سے کیا گیا اس میں وہی لوگ لئے گئے جو سربرآوردہ اور مسلمانوں میں اچھی نظروں سے دیکھے جاتے تھے پائے تخت یعنی مدینہ منورہ کے قاضی زید ابن ثابت مقرر کئے گئے جو رسول اللہؐ کے زمانے میں کاتب وحی رہ چکے تھے وہ سریانی اور عبرانی زبان کے ماہر تھے اور علوم فقہیہ میں سے فرائض کے فن میں تمام عرب میں ان کا جواب نہ تھا۔(۹)

حضرت ابودردہؓ کو بھی مدینہ میں قاضی بنایا۔(۱۰) انہوں نے دمشق میں بھی قضا کا کام کیا کعب ابن سورالازویؒ بصرہ کے عبادہ ابن صامتؓ فلسطین کے اور عبداللہ بن مسعودؓ کوفہ کے قاضی تھے ان کے بعد کوفہ کے قاضی شریح بنائے گئے۔(۱۱)

یہ کبار تابعین میں سے ہیں پچھتر سال تک قاضی رہے۔حضرت عبداللہ بن زبیر کے فتنہ میں تین سال کے لئے معطل کردئے گئے تھے۔پھر حجاج نے ان کو قاضی بنادیا ان کی تقرری کا واقعہ عجیب ہے۔حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے پسند کی شرط پر ایک گھوڑا خریدا اور امتحان کے لئے ایک سوار کو دیا گھوڑا سواری میں چوٹ کھا کر داغی ہوگیا۔حضرت عمرؓ نے اسے واپس کرنا چاہا گھوڑے کے مالک نے انکار کیا اس پر نزاع ہوئی اوشریح ثالث مقرر کئے گئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگر گھوڑے کے مالک سے اجازت لے کر سواری کی گئی ہے تو گھوڑا واپس کیا جاسکتا ہے ورنہ نہیں حضرت عمرؓ نے کہا حق یہی ہے اور اسی وقت شریح کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا۔(۱۲)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ قاضیوں کو خوب سوچ سمجھ کر متعین کرتے صرف دور ہی سے نہیں بلکہ قریب سے بھی رکھ لیتے۔ان قاضیوں کے علاوہ قیس بن العاص سہمی (۱۳) جمیل ابن عامر ابومریم الحنفی، سلمان بن ربعیۃ الباہلی، عبدالرحمٰن بن ربیعہ، ابو قرۃ الکندری، عمران بن الحصین حضرت عمرؓ کے زمانے کے قضاۃ ہیں۔(۱۴)

یہ محکمہ دور فاروقی میں وسیع ہوتا گیا اپنے اسلاف کی طرح خود فاروق اعظمؓ بھی مقدموں کا فیصلہ کرتے ایک عورت اپنے شوہر کو لے کر آئی شوہر نے اس کی لونڈی سے دوران سفر میں جماع کرلیا تھا۔آپ نے شوہر سے دریافت فرمایا اس نے عرض کیا کہ حضرت میری عورت نے اس لونڈی کو ہبہ کردیا تھا۔حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دلیل لاؤ ورنہ تمہیں سنگسار کردوں گا مگر اس کے بعد عورت نے خود ہی اقرار کرلیا کہ اس نے شوہر کو ہبہ کردیا تھا۔صرف مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی اپنے مقدمات حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کرتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ فیصلہ غیر مسلم کے حق میں ہوتا ایک مسلم اور ایک یہودی دونوں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت عمرؓ حق یہودی کی طرف دیکھا اور اس کے حق میں فیصلہ کردیا۔(۱۵)

دوفاروقی گزر جانے کے بعد دور عثمانی آیا حضرت عثمانؓ اس محکمہ میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہ کی انہوں نے اپنے خلافت کے دوران میں عمر فاروقؓ کی پیروی کی خود بھی بعض معاملات کا فیصلہ کرتے خلافت کا تاج پہنتے ہی ان کے سامنے سب سے پہلا مقدمہ حضرت فاروقؓ کے صاحبزادے حضرت عبیداللہؓ کا پیش کیا گیا انہوں نے ہرمزان اور جفینہ کو اس گمان میں قتل کردیا تھا کہ وہ دونوں حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کی سازش میں شریک تھے عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ بیعت کے بعد مسجد میں تشریف فرما ہوئے اور عبیداللہ بن عمرؓ کو بلایا مہاجرین وانصار بھی وہاں موجود تھے آپ نے لوگوں سے کہا کہ آپ حضرات مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔حضرت علیؓ نے فرمایا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ ان کو قتل کردیں لیکن بعض مہاجرین نے کہا ابھی کل عمرؓ شہید کئے گئے ہیں اور آج ان کا بیٹا قتل کیا جائے۔حضرت عمر بن عاصؓ نے عرض کیا حضرت اللہ تعالی نے آپ کو مجاز بنادیا ہے کہ آپ مسلمانوں کے معاملے میں جو چاہیں کریں۔۔آج یہ معاملہ پیش ہے کیا

آپ کو پورا اختیار نہیں؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا ہاں میں مقتولین کا ولی ہوں اور میں دیت چاہتا ہوں جسے میں اپنے مال سے ادا کروں گا۔ یہ بہترین اس مشکل کا حل تھا۔(۱۶)

ہمیں دور عثمانی میں محکمہ قضا کی کوئی خاص تفصیل نہیں ملتی جس سے یہ معلوم ہو کہ حضرت عثمانؓ نے کوئی تبدیلی کی ہو۔ مورخین عام طور پر حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق محکمہ قضا کی تفصیلات دیتے ہیں اور اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے قضا کا تذکرہ کہیں کہیں ضمنا کر دیتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اگر کوئی خاص اس شعبہ کو ترقی نہ دی تو اس میں کچھ کمی بھی نہ ہونے دی۔ حضرت عثمانؓ کے آخری دور میں مختلف دیار و امصار سے امراء کے متعلق کافی شکایتیں موصول ہوئی مگر کہیں بھی قاضیوں کے متعلق کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

عثمانی دور کے بعد حضرت علیؓ کی خلافت شروع ہوتی ہے ان کی خلافت ہنگاموں اور لڑائیوں میں گزری جس کی وجہ سے مورخین عموما ان لڑائیوں کی تفصیلات ہی زیادہ لکھتے ہیں تاہم ضمنا قضا کے واقعات کا بھی تذکرہ بھی آجاتا ہے۔ حضرت علیؓ چونکہ خود بہت بڑے قاضی تھے۔ آنحضورؐ نے ان کے متعلق فرمایا تھا۔ **اقضاھم علی**(۱۷) (ترجمہ) قضا کی لیاقت لوگوں میں سب سے زیادہ حضرت علی میں ہے"

اس لئے حضرت علیؓ نہ صرف محکمہ قضا برقرار رکھا بلکہ اس کے انتظامی شعبوں میں اور ترقی دی خود بھی کبھی کبھی مستند قضا پر متمکن اور فیصلہ کرتے تاریخ وسیر کی کتابوں میں ان کے فیصلے منقول ہیں۔ ہم مقالہ کی طوالت کی وجہ سے اس وقت کوئی واقعہ نقل نہیں کر سکتے۔(۱۸)

حضرت علیؓ نے بھی اپنے قاضی مختلف شہروں اور جگہوں میں متعین کئے ان کے دور میں پائے سلطنت کوفہ کے مشہور قاضی شریح تھے جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

میں نے ابھی تک محکمہ قضا کا تذکرہ اجمالی طور پر کر دیا ہے اور خلفاء کے بعض فیصلے بھی نقل کر دیئے ہیں جن سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ قضا کا انتظام ہر خلیفہ کے دور میں کسی نہ کسی حال میں ضرور رہا اب آپ کے سامنے بعض عنوانات کے تحت اور تفصیلات رکھوں گا۔

اصولِ قضا

حضرت ابو بکرؓ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے قضا کا باقاعدہ محکمہ قائم کیا تو اس کے لئے آئین وقوانین بھی متعین فرمائے جو تمام کے تمام قرآن وحدیث سے مستنبط تھے ہمارے سامنے اس وقت دو فرمان موجود ہیں۔ ایک فرمان ہے جسے علامہ شبلیؒ نے طبقات الفقہاء علامہ بیہقی کے حوالے سے الفاروق میں نقل کا ہے جو کوفہ کے قاضی ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام ہے اور دوسرا فرمان ہے جسے مشہور مورخ خضریؒ نے اپنے محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ میں نقل کیا ہے جو قیس بن ابی العاص قاضی مصر کے نام ہے دونوں کے الفاظ ہم ملتے جلتے ہی ں اور مفہوم تقریبا ایک ہی ہے۔ علامہ شبلیؒ نے پھر اس فرمان کا خلاصہ کیا ہم اسی خلاصہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱)۔ قاضی کو عدالتانہ حیثیت سے تمام لوگوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا چاہئے۔۲۔ بار ثبوت عموما مدعی پر ہے۔۳: مدعا علیہ اگر کسی قسم کا ثبوت یا شہادت نہیں رکھتا ہو تو اس سے قسم لی جائے گی۔۴: فریقین ہر حالت میں صلح کر سکتے ہیں لیکن جو امر خلاف قانون ہے اس میں صلح نہیں ہو سکتی۔۵: قاضی خود ہی اپنی مرضی سے مقدمہ کے فیصلے کرنے کے بعد اس میں نظر ثانی کر سکتا ہے۔۶: مقدمہ کی پیشی کی ایک تاریخ معین ہونی چاہئے۔ ۷: تاریخ معینہ پر اگر مدعا علیہ حاضر نہ ہو تو مقدمہ یک طرفہ فیصل کیا جائے گا۔۸: ہر مسلمان قابل ادائے شہادت ہے لیکن جو شخص سزا یافتہ ہو، جس کا جھوٹی گواہی دینا ثابت ہو وہ قابل شہادت نہیں۔(۱۹)

یہی وہ اصول تھے جن پر محکمہ قضا کی بنیادیں استوار ہوئیں اور بعد کو ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ یہ اصول اپنے

زبان حال ہی سے اپنے کامل ومکمل ہونے کی شہادت دے رہے ہیں ان پر مزید تبصرہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

قاضیوں کی ایمانداری:

خلفائے راشدین کے دور میں تاریخ ایک بھی ایسا قاضی (Judge) پیش نہیں کرتی جس پر کسی قسم کی بددیانتی کا الزام ہو بلکہ ان کا ہر ایک فرد شریعت کا مکمل پابند ہوتا اور صحیح فیصلوں تک پہنچنے کی پوری پوری کوشش کرتا عبداللہ بن مسعودؓ کوفہ کے قاضی تھے وہ اپنے فیصلوں میں کسی کی رعایت نہ کرتے اور نہ اپنے اس عہدے کی وجہ سے یہ چاہتے کہ لوگ ان کی عزت کریں ان کی مشایعت میں چلیں جیسا کہ آج کل کے حکام کا شعار بن چکا ہے ایک بار نکلے کچھ لوگ ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے رک کے فرمایا کیا تمہیں کوئی ضرورت ہے لوگوں نے عرض کیا نہیں فرمایا لوٹ جاؤ کیونکہ اس طرح چلنا تابع کے لئے ذلت اور متبوع کے لئے فتنہ ہے۔(۲۰)

مساوات:

امیر ہو یا غریب راعی ہو رعایا ان کی نظر میں سب یکساں تھے۔قاضی شریحؒ ایک مشہور قاضی ہیں۔ان کو حضرت عمرؓ نے متعین کیا تھا۔حضرت علیؓ جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے بھی انہیں برقرار رکھا۔یہ کوفہ کے قاضی تھے حضرت علیؓ کی زرہ گم ہوگئی تھی اتفاق سے ایک یہودی کے پاس اسے دیکھ لیا فرمایا زرہ میری ہے اسے میں نے تمہارے ہاتھ فروخت کیا ہے اور نہ ہبہ کیا ہے یہودی نے کہا زرہ میری ہے اور میرے قبضے میں ہے حضرت علیؓ نے قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا قاضی شریح نے یہودی سے دریافت کیا کہ تم کیا کہتے ہو اس نے کہا کہ زرہ میری ہے اور میرے قبضے میں ہے پھر حضرت علیؓ سے دریافت کیا آپ کے پاس کوئی دلیل یا شہادت ہے فرمایا ہاں قنبر اور حسن شاہد ہیں قاضی شریح نے کہا کہ بیٹے کی شہادت باپ کے لئے جائز نہیں۔(۲۱) بالآخر فیصلہ یہودی کے حق میں ہوا مگر یہودی نے یہ دیکھ کر زرہ بھی واپس کردی اور خود مشرف بہ اسلام ہوگیا۔

اس فیصلہ پر نگاہ ڈالنے حاکم وقت ایک طرف مدعی بنا ہوا ہے اور مدعا علیہ حقیر آدمی ہے اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ غیر مسلم ہے مگر قاضی کے فیصلے میں ذرا سی لچک نہیں ہوتی۔اور وہ صاف وہی فیصلہ کرتا ہے جو اصول اور قانون کے مطابق ہے۔

قاضیوں کو تنبیہ

دراصل اس کی وجہ یہ تھی کہ خلفا خود بھی قاضیوں کو پوری تاکید کرتے کہ وہ اصول وضابطہ کے خلاف نہ کریں اور موقعہ بموقعہ ان کو تنبیہ بھی کردیا کرتے ایک دفعہ حضرت عمرؓ اور ابن ابی کعبؓ میں کچھ نزع ہوئی ابی کعبؓ نے زید بن حارثؓ کے یہاں مقدمہ دائر کیا حضرت عمرؓ مدعی علیہ کی حیثیت سے حاضر ہوئے زید بن حارثؓ تعظیم دی حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ تمہارا پہلا ظلم ہے پھر یہ کہہ کر ابیؓ کے برابر بیٹھ گئے۔ابیؓ کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔اور حضرت عمرؓ کو دعوی سے انکار تھا ابی نے قاعدہ کے مطابق حضرت عمرؓ سے قسم لینی چاہی لیکن زیدؓ نے ان کے رتبہ کا پاس کرکے ابیؓ سے درخواست کی امیر المومنین کو قسم سے معاف رکھو حضرت عمرؓ اس طرفداری پر برہم ہوئے زید کی طرف مخاطب ہوکر کہا جب تک تمہارے نزدیک ایک عام آدمی اور عمرؓ دونوں برابر نہ ہوں تم منصب قضا کے قابل نہیں سمجھے جاسکتے۔(۲۲)

فیصلوں کی ارزانی

خلفائے راشدین کے دور مسعود میں قاضیوں کا جو حال رہا شاید تاریخ ایسے لوگوں کو پیش نہیں کرسکتی جن سے ایسے حالات ظاہر ہوں مگر جو سب سے بڑی چیز ان کے دور میں تھی وہ یہ تھی کہ فیصلے انتہائی آسانی سے ہوجاتے دور حاضر کی طرح تاریخوں پر تاریخیں نہیں پڑتی تھیں بلکہ ادھر مدعی اور مدعا علیہ آئے اور شہادتیں لی گئیں اگر شہادت نہیں ہے تو قسم پھر معاملہ صاف تھا۔عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی ایک نالی ایک شخص کے باغ سے گذرتی تھی انہوں نے بدلنا چاہا مگر باغ والے نے رد

کر دیا۔ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے اور اپنی باتیں پیش کیں حضرت عمرؓ نے سنا ان کو بدلنے کی اجازت دے دی۔
ایک شامی حضرت عمرؓ کی خدمت میں آیا اور اپنی عورت کے متعلق شکایت کی کہ اس کا ایک شخص کے ساتھ ناجائز تعلق ہے حضرت عمرؓ نے فوراً ابو واقد حبشی کو اس کی طرف بھیجا انہوں نے اس سے دریافت کیا کافی اصرار کے بعد اس نے اقرار کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے بعد رجم کا فیصلہ کر دیا۔ (۲۳)
اس قسم کے بہتیرے واقعات ہیں شاید ہی کوئی مقدمہ ایسا ہے جس کے فیصل کرنے میں قاضیوں کو کئی دن لگ گئے ہوں، مہینوں اور سالوں کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔
خلفاء راشدین کے دور مبارک کے اس محکمہ کی اگر یہی خوبی دیکھی جائے تو دور حاضر کی متمدن سے متمدن حکومت میں اس کی مثال نہیں مل سکتی پس ماندہ ممالک کو تو چھوڑیئے ان ملکوں میں دیکھتے جہاں کے رہنے والے اپنے تہذیب کا دیوتا اور تمدن کا علمبردار کہتے ہیں تو آپ کو ان فیصلوں کی صحیح قیمت کا اندازہ ہوگا۔
الغرض خلفائے راشدین کے دور میں قضا کا بڑا اچھا انتظام رہا اور دنیا کے سامنے ایک ایسی مثالی عدالت آ گئی جہاں فیصلے روپیوں کے بل بوتے پر نہیں بلکہ حق وانصاف کے بھروسے پر ہوئے جس عدالت کے قاضیوں نے شاہ دگدا وزیر اعظم اور چپراسی کو ایک نگاہ دیکھا۔ دنیا کو پھر ایسے قاضیوں اور ایسی ہی عدالتوں کی ضرورت ہے تا کہ انصاف قائم ہو سکے اور دنیا کو انصاف کے لئے جو روپیہ اور وقت خرچ کرنا پڑتا ہے اس سے نجات مل جائے

۱)۔۔۔(۲) مشکوٰۃ شریف، ص:۳۴۷ (۳) کنز العمال بحوالہ الفاروق جلد:۲ (۴) فرستادہ (۵) کنز العمال بحوالہ الفاروق جلد:۲ (۶) خضری، ص:۲۶۴ (۷) تاریخ الخلفاء، ص:۹۳ (۸) الفاروق صیفہ عدالت (۹) خضری، ص:۱۳، جلد:۲ (۱۰) صفۃ الصفوۃ (۱۱) الفاروق (۱۲) خضری (۱۳) الفاروق (۱۴) ازالۃ الخفاء مقصد ثانی، جلد:۲، ص:۱۲۱ (۱۵) مشکوۃ، ص:۴۷۲ (۱۶) خضری جلد:۲، ص:۳۹ (۱۷) ایضاً، ص:۴۸۱ (۱۸) ایسے واقعات ازالۃ الخلفاء اور اخبار القضاۃ میں کافی ہیں (۱۹) الفاروق (۲۰) صفۃ الصفوۃ جلد:۱ ص:۱۶۰ (۲۱) تاریخ الخلفاء ملخصا، ص:۲۵۱ (۲۲) الفاروق (۲۳) ازالۃ الخفاء ص:۱۲۱

ڈاکٹر محمد رفیق

گیسٹ فیکلٹی شعبہ عربی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد

خواجہ اجمیریؒ — نمونۂ دعوت دین

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ (فصلت :۳۳)

''اور اس سے زیادہ اچھی بات والا کون ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک کام کرے اور کہے کہ میں یقیناً مسلمانوں میں سے ہوں''

قرآن کی دعوت اللہ کی طرف بلانے کی دعوت ہے، انسان کو اس کے رب سے جوڑنا، انسان کو خدا کی یاد میں جینے والا بنانا، انسان کے اندر یہ شعور ابھارنا کہ وہ ایک خدا کو مرکز توجہ بنالے، یہی قرآنی دعوت کا اصل منشأ ہے اور بلاشبہ اس پکار سے بہتر کوئی پکار نہیں۔

مگر خدا کا داعی صرف وہ شخص بنتا ہے جو اپنی دعوت میں اس حد تک سنجیدہ ہو کہ جو کچھ وہ دوسروں سے منوانا چاہتا ہے اس کو وہ خود سب سے پہلے مان چکا ہو، وہ دوسروں سے جو کچھ کرنے کے لئے کہہ رہا ہے، خود سب سے پہلے اس کا کرنے والا بن جائے۔

داعی کا سب سے بڑا ہتھیار یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ ایک طرفہ حسن سلوک کرے، دوسرے لوگ برائی کریں، تب بھی وہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرے، وہ اشتعال کے مقابلے میں اعراض اور اذیت کے مقابلہ میں صبر کا طریقہ اختیار کرے، یکطرفہ حسنِ سلوک میں اللہ تعالیٰ نے زبردست تسخیری قوت رکھی ہے، خدا کا داعی خدا کی اس بنائی ہوئی فطرت کو جانتا ہے اور اس کو آخری حد تک استعمال کرتا ہے، خواہ اس کے لئے اس کو اپنے جذبات کو کچلنا پڑے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی دنیا کے لئے ہندوستان کی دریافت گویا کہ ایک نئی دنیا کی یافت تھی،

اورایک طرح سے یہ ایک انقلاب انگیز اور عہد آفریں واقعہ تھا، یوں تو پہلی صدی ہجری ہی میں اسلام کے حوصلہ مند دستے آنے شروع ہوگئے تھے اور ۹۳ھ میں محمد بن قاسم ثقفی نے سندھ سے ملتان تک کے علاقہ کو اپنی شمشیر واخلاق سے تسخیر کرلیا تھا اور اس برصغیر میں چھوٹے چھوٹے دعوت کے مرکز اور خانقاہیں قائم ہوچکی تھیں، لیکن ہندوستان کی حقیقی فتح کا سہرا سلطان محمود غزنوی کے سر اور مستحکم اور مستقل اسلامی سلطنت کے قیام کی سعادت سلطان شہاب الدین محمد غوری کے حصہ میں تھی اور آخری طور پر اس کی روحانی تسخیر اور اخلاقی و ایمانی فتح حضرت خواجہ بزرگ شیخ الاسلام معین الدین چشتی کے لئے مقدر ہوچکی تھی، حکمت الٰہی نے چاروں مشہور روحانی سلسلے قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ میں سے ہندوستان کی روحانی فتح اور اس سرزمین پر اسلام کا پودا نصیب کرنے کے لئے چشتی سلسلہ کا انتخاب فرمایا۔

خواجہ ابو محمد چشتیؒ اس سلسلہ کے سب سے پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے ہندوستان کا رخ کیا، اور ان کی دعاؤں کی برکت سے محمود غزنوی کو فتوحات حاصل ہوئیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے خواجہ ابو محمد چشتی کے کام کی تکمیل اور اسلام کی عمومی اشاعت اور مستحکم اسلامی مرکز رشد و ہدایت کا قیام چشتیہ سلسلہ کے ایک شیخ الشیوخ خواجہ معین الدین چشتی کے لئے مقدر کردیا تھا، آپ نے قدیم ہندوستان کے سیاسی اور روحانی مرکز اجمیر کو اپنے قیام کے لئے انتخاب فرمایا جو راجپوت حکومت وسیاست اور ہندو مذہب و روحانیت کا بہت بڑا مرکز تھا، اجمیر میں قیام کا فیصلہ آپ کے عالی ہمتی اور جرأت ایمانی کی دلیل اور ایسا روشن کارنامہ ہے جس کی مثال صرف اور صرف مذہبی پیشواؤں اور فاتحین عالم کی تاریخوں میں ملتی ہے، آپ نے اس شہر سے دعوتی مشن کو آگے بڑھایا اور دعوت دین کے فکر کے پودے کو نصب کیا، آپ کے استقلال و اخلاص، توکل واعتماد اور زہد وقربانی نے سرزمین ہند کی تقدیر بدل دی، جو سرزمین ہزاروں برس سے صحیح یقین اور صحیح معرفت سے محروم اور توحید کی صداقت سے ناآشنا تھی، وہ علماء اور اولیاء کی سر زمین اور علوم اسلامیہ ودینیہ کی محافظ وامین بن گئی، اور جس سرزمین کے باشندے شرک و بت پرستی میں مبتلا تھے اور اینٹ، پتھر، درخت و جانور، گائے وگوبر کو سجدہ کرتے تھے اور جنہوں نے کبھی اللہ اکبر کی صدا نہیں سنی تھی، خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اس سرزمین پر مبارک قدم اور روحانی دعوت نے ان کے دلوں کی دنیا بدل دی اور کفر وشرک کی ظلمت وتاریکی سے نکال کر ان کے دلوں کو اسلام کے نور سے روشن کردیا، حضرت خواجہ کے دعوت دین کی تاثیر اس ملک میں اس طرح پھیلی کہ شعائر شرک کی جگہ مسجد ومحراب نظر آنے لگے، اور فضاؤں میں اللہ اکبر کی صدا گونجنے لگی، سیر الاولیاء کے مصنف نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس واقعہ کو بیان کیا ہے:

''اس ملک ہندوستان میں جس کو دولت اسلام ملی اور قیامت تک جو بھی اس دولت سے مشرف ہوگا، نہ صرف وہ؛ بلکہ اس کی اولاد در اولاد، نسل در نسل سب ان کے نامۂ اعمال میں ہوں گے اور اس میں قیامت تک جو بھی اضافہ ہوتا رہے گا اور دائرہ اسلام وسیع ہوتا رہے گا، قیامت تک اس کا ثواب شیخ الاسلام معین حسن سنجری کی روح کو انشاء اللہ پہونچتا رہے گا''

قرآن پاک کی آیت کریمہ: ﴿ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴾ (یونس:۶۲) ''یاد رکھو کے اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں'' سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے سچے داعیوں کا گروہ وہ خدا کے دوستوں (اولیاء اللہ) کا گروہ ہے، اگرچہ کہ دعوت اس دنیا کے تمام کاموں میں مشکل ترین کام ہے، داعی اپنے وجود کو دعوتی عمل میں شامل کرلیتا ہے، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ کسی پیغام کا داعی بن سکے، اس سے بھی سخت مرحلہ وہ ہے جو مخاطبین کی طرف سے پیش آتا ہے، اسی طرح کار نبوت کو انجام دینے کے لئے نبوی صفات کا حامل ہونا بھی ضروری ہوتا ہے، اور نبی جن مصائب اور مشقتوں سے دوچار ہوتا ہے ان کے وارثین جنہیں اللہ تعالیٰ کار نبوت کو انجام دینے کے لئے منتخب فرماتا ہے کو بھی مشکل ترین حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، امت کو راہ راست

پر لانے کی فکر اور دل میں تڑپ ان کی خصوصیت ہوتی ہے ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی کے بارے میں فرمایا:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفاً﴾ (الکہف:٦)

''پس اگر یہ لوگ اس بات پر ایمان نہ لائیں تو کیا آپ ان کے پیچھے اس رنج میں اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے؟''

اس آیت کریمہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ داعی اگر دعوت کے معاملہ میں سنجیدہ ہو تو شدت احساس سے اس کا کیا حال ہو جاتا ،حقیقت یہ ہے کہ دعوت حق کا اتمام اس انتہا پر پہنچ کر ہوتا ہے ، جب یہ کہا جانے لگے کہ داعی شاید اس غم میں اپنے آپ کو ہلاک کر دے گا کہ لوگ حق کی دعوت کو قبول نہیں کر رہے ہیں۔

ایک دعوت جو دلیل کے اعتبار سے بالکل واضح ہو، جس کو پیش کرنے والا دردمندی کی آخری حد پر پہونچ کر اس کو لوگوں کے لئے سنجیدہ غور وفکر کا موضوع بنادے ، اس کے باوجود لوگ اسے نہ مانیں تو اس کے نہ ماننے کی وجہ دنیا کی دل فریبیاں ہیں، موجودہ دنیا اتنی پرکشش ہے کہ آدمی اس سے اوپر اٹھ نہیں پاتا ؛اس لئے وہ ایسی دعوت کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتا، جو اس کی توجہات کو سامنے کی دنیا سے ہٹا کر اس دنیا کی طرف لے جارہی ہے ، جس کی رونقیں بظاہر دکھائی نہیں دیتیں ،مگر زمین کی دل فریبیاں انتہائی عارضی ہیں ، وہ امتحان کی ایک مقررہ مدت تک ہیں ، اس کے بعد زمین کی یہ حیثیت ختم کر دی جائے گی ، یہاں تک کہ وہ صحراء کی طرح ایک خشک میدان ہو کر رہ جائے گی۔

ایک سچے داعی کی ہمیشہ یہی فکر ہوتی ہے کہ اللہ کے بندے شرک وبت پرستی کو ترک کر کے ایک خدا کی پرستش میں لگ جائیں ، وہ اپنی ذات کو خدمت خلق اور دعوت دین میں فنا کر دیتا ہے ، خواجہ اجمیریؒ کی ذات بابرکات ان تمام تر صفات حمیدہ کی حامل تھی ، آپ نے اپنی دعوتی مشن کے فروغ کے لئے اجمیر جیسی سرزمین کا انتخاب کیا ، جو طاقت ور ہندو راجاؤں کی حکومت اور کفر و شرک اور بت پرستی کا گہوارا تھی۔

اس سرزمین کو دعوت دین کا مرکز بنانا کوئی آسان کام نہ تھا؛ کیوں کہ وہاں دین کی بات ماننا تو دور کوئی سننے کے لئے تیار نہ تھا، مگر آپ نے بے خوف وخطر ارشاد وتلقین کا کام جاری رکھا ، آپ کے اعمال حسنہ ، حسن سلوک اور روحانی و دعوتی پیغام سے متاثر ہو کر جوق در جوق لوگ مشرف بہ اسلام ہوے ، بڑی سے بڑی حکومتی طاقت آپ کی جرأتِ ایمانی کے سامنے ٹک نہ سکی ، اور آپ نے دعوتی میدان میں کام کرنے والوں کے لئے داعیوں کی حفاظت سے متعلق قرآنی آیت کا صحیح نمونہ پیش کیا ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدہ :٦٧)

''اے رسول! جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجئے ، اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت ادا نہیں کی ، اور آپ کو اللہ تعالی لوگوں سے بچالے گا''

شاعر اپنے دور کے سیاسی سماجی اور ادبی ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور ان تبدیلیوں سے اس کا مکمل طور پر واقف ہونا اس کے شعور کی فعالیت کو ظاہر کرتا ہے اور یہیں سے وہ تجربہ پسندی کے لئے وجہ تلاش کرنا ہے اور اپنی شاعری میں اس کو برتتا ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے اندر تین باتیں پائی جائیں تو اللہ تعالی اسے اپنا دوست رکھتا ہے۔

(۱) دریا جیسی سخاوت

(۲) آسمان جیسی شفقت

(۳) زمین جیسی عاجزی

ڈاکٹر سمیہ تمکین
اکیڈمی اسوسیٹ ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی

منفرد لب ولہجہ کا شاعر ناصر کاظمی

شاعر اپنے دور کے سیاسی سماجی اور ادبی ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ان تبدیلیوں سے اس کا مکمل طور پر واقف ہونا اس کے شعور کی فعالیت کو ظاہر کرتا ہے اور یہیں سے وہ تجربہ پسندی کے لئے وجہ تلاش کرتا ہے اور اپنی شاعری میں اس کو برتتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد جب زندگی نئی تشکیل کی طرف متوجہ ہونے لگی تو صورتِ حال زیادہ امید افزا نہ تھی۔ تقسیم سے پہلے کے نمایاں شعری رجحانات مثلاً وطنیت، رومانیت، عشق اور انقلابیت وغیرہ کافی پرانے ہو گئے تھے۔ تقسیم کے واقعہ نے انسانی ذہن کو درہم برہم کر دیا تھا، تقسیم ہند سے پہلے کے شعراء کی شاعری ایک گھٹی ہوئی چیز بن کر رہ گئی اور جو نئی نسل کے شعراء تھے وہ محض اپنے زخموں کا شمار کرنے میں لگے ہوئے تھے، لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ ان شعراء میں ایک ایسا شاعر بھی موجود تھا جو ساری فضاء کو روشن کرنے کا وصف رکھتا تھا اور وہ تھا ناصر کاظمی۔ ناصر کاظمی تقسیم کے بعد اردو شاعری کو ایک نیا تخلیقی مزاج عطا کرنے میں پیش رو کا درجہ رکھتے ہیں۔

ناصر کاظمی کا اصلی نام ناصر رضا ہے۔ آپ ۸/دسمبر بہ روز ہفتہ ۱۹۲۵ء کی علی الصبح اپنے نانا مرحوم کے گھر محلّہ قاضی واڑہ میں پیدا ہوئے۔ ناصر کاظمی ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔

ناصر کاظمی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی مکمل شخصیت ان کی شاعری کی ساحرانہ کیفیات میں ڈوبی ہوئی ہے، جس کے تعلق سے وہ خود لکھتے ہیں:

''میری باتیں سچی کھری خوب صورت اور رنگ و آواز کا ایک مجموعہ ہوتی ہیں، لوگ کیوں نہ سنیں، میں پچھلی رات کا ایک جادو ہوں۔ چڑھتے سورج کی دنیا کو اپنے لفظوں سے مسحور کرتا ہوں''۔ (بحوالہ ناصر کاظمی۔ چند پریشان کاغذ، ص:۶۴)

ناصر کاظمی کے مزاج کا بنیادی وصف واقعیت اور حقیقت پسندی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری صرف عشق کے معاملات ہی تک محدود نہ رہی بلکہ وہ زندگی کی عام حقیقتوں کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔

ناصر کاظمی کی شخصیت کا خاص وصف ان کی سادگی تھا، صفائی ان کی جان اور خلوص وصداقت ان کا جوہر۔ برجستگی اور بے ساختگی، شگفتگی اور شادابی، توازن اور ہم آہنگی ان کی شخصیت کے خاص پہلو ہیں۔

ناصر کاظمی جدید دور کے عظیم شاعر گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز ۱۹۴۰ء کے آس پاس کیا تھا۔ شروع میں یہ اختر شیرانی سے بہت متاثر تھے اور ان ہی کے رنگ میں شاعری کیا کرتے تھے، لیکن بعد میں حفیظ ہوشیار پوری کی شاگردی میں غزل کہنا شروع کیا۔ ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں علامتوں کے ساتھ ساتھ پیکر گراشی سے بھی کام لیا ہے۔ انہوں نے تقسیم ہند کے فسادات اور خون ریزی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کا اپنی شاعری میں برملا اظہار بھی کیا۔

ناصر کاظمی کی شاعری متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ انہوں نے زندگی کے حسن کے متعدد پہلوؤں اور ان کی رنگا رنگی کو اپنے اشعار میں سمیٹا ہے۔ ان کی شاعری اپنی تمام تر دلکشیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہے۔ یہ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

کس سے کہوں کوئی نہیں سو گئے شہر کے مکیں
کب سے راہ میں میت شہر ہے کفن
ہوائے ظلم یہی ہے تو دیکھنا اک دن

زمین پانی کو سورج کرن کو ترسے گا
گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

ان کی شاعری میں روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ جدید موضوعات پر بھی اشعار اور نظمیں ملتی ہیں۔ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں روایتی موضوعات کو بھی جدید رنگ میں پیش کیا ہے۔ان کا طرز احساس بھی نیا ہے اور طرز اظہار بھی۔غزل کا بنیادی موضوع عشق ہے،جس پر ہر شاعر نے ہر دور میں اظہار خیال کیا ہے،لیکن ان کے عشق کا محرک روایتی عشق سے بہت الگ معلوم ہوتا ہے۔یہاں پر عشق کی پہچان واقعیت اور ارضیت پر مبنی ہے جو موجودہ حالات کی دین ہے۔

ناصر کاظمی نے تقسیم کے نتیجے میں برپا ہونے والے فسادات کو موضوع بنایا ان کی شاعری گزرے ہوئے موسم کی طرح ہے۔ان کے یہاں حال سے زیادہ ماضی کا غم ملتا ہے۔ماضی کے غم کے حوالے سے وہ ایک مٹتی ہوئی تہذیب اور وہ بزرگ جو ہمارے درمیان سے اٹھتے جارہے ہیں انہیں یاد کرتے ہیں ؎

جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہوگئے ہیں
یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمین کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوئے
کیا کہوں تم سے اب خزاں والو
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

ناصر کاظمی کو فطرت سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔وہ خود فطرت کے تعلق سے یوں رقمطراز ہیں:

''میں فطرت کا نمائندہ ہوں۔جو دیکھتا ہوں،سنتا ہوں،محسوس کرتا ہوں،ماضی،حال اور مستقبل کی قید سے باہر نکل کر بیان کرتا ہوں۔لوگ میرے شعروں کو پچھلی رات غور سے پڑھیں،تجربے،مشاہدے اور علم ونظر سے کام لیں۔میر وغالب کی اور بات،وہ بڑے اور پرانے لوگ تھے۔بہت کم شاعر مجھے دل سے پسند ہیں وہی جو سچے اور منفرد جبلی فطری ہیں''۔(بحوالہ:چند پریشاں کاغذ۔ص:۶۵)

ناصر کاظمی کو زندگی بہت عزیز ہے،وہ اس سے اکتاتے نہیں،زندگی بسر کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ان کو انسان اور انسانی حسن کے علاوہ فطرت کے مناظر سے بھی دلچسپی رہی ہے اور موسموں سے لطف حاصل کیا۔ان تمام پہلوؤں کی ترجمانی ناصر کاظمی نے اپنی شاعری بالخصوص اپنی غزلوں میں کی ہے ؎

ساز ہستی کی صدا غور سے سن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سن
یاس کی چھاؤں میں سونے والے
جاگ اور شور درا غور سے سن

ان کی شاعری کی خاص بات یہ ہے کہ وہ بہت کم لفظوں میں خیال وخواب کی متنوع تحریریں سجاتے ہیں اور وہ مستند یا روایتی لفظیات کے بجائے عام طور پر روزمرہ کی زبان میں بولے جانے والے سیدھے سادے الفاظ کو استعمال کرتے ہیں یہ دوسروں کی طرح عالمانہ زبان استعمال کرنے کے بجائے سادہ بے تکلف اور مانوس زبان استعمال کرتے ہیں،ان کا کل سرمایہ سیدھے سادے الفاظ ہیں،جنہیں وہ تخیل کی مدد سے پیکروں میں تبدیل کرتے ہیں ؎

اب نہ چیخیں گی اندھیری راتیں
چاند نکلا چمنستان چمکے

ان کی شاعری میں غم،یاسیت،ملال،اداسی،یاد وغیرہ تخلیقی تجربہ بن کر رہ گئی اور یہی وہ تخلیقی قوت ہے جس سے ناصر کاظمی کی انفرادیت متعین ہوتی ہے ؎

وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تیری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا
وہ

ناصر کاظمی نے نہ صرف اپنی انفرادی آواز کی تشکیل کی بلکہ اپنے لب ولہجہ سے پڑھنے والوں کو متاثر کیا ہے ؎

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی

مزے ملے انہی راتوں میں زندگی کے مجھے

ناصر کاظمی کے اشعار اپنے اندر تجربات کی نئی دنیا رکھتے ہیں جن کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے نئے دور کی ساری کسک ان میں سمٹ گئی ہو۔

انہوں نے روایت سے رشتہ نہیں توڑا بلکہ روایت کو تجربے سے ہم آہنگ کیا۔غزل کی قدیم علامتیں ان کے یہاں نئے روپ میں ملتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ نئی علامتوں اور نئے اشاروں کی تخلیق کا سلسلہ بھی نظر آتا ہے۔ناصر کاظمی نے غزل کو بالکل ہی ایک نئی شکل دی ہے۔ان کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ حالات کو نئے زاویوں سے دیکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے موضوعات میں جدت پائی جاتی ہے۔

ناصر کاظمی کے کلام میں عشقیہ واردات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔انہوں نے عشق کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا بلکہ یہ زندگی پر محیط ہے۔عشق کی کیفیات کا بیان ایک نئے انداز اور لب ولہجہ کے ساتھ کیا گیا ہے اور یہ کیفیات بالکل نئی ہیں۔ان کی عشقیہ شاعری کی نوعیت تمام تر جذباتی نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کی بنیادی حقائق سے بھی اس کا تعلق ہے۔ان کے یہاں عشقیہ واردات کے ساتھ زمانے کے غم کا احساس انتہائی شدومد کے ساتھ ملتا ہے ؎

ایسا الجھا ہوں غم دنیا میں
ایک بھی خواب طرب یاد نہیں
تیرا ملنا تو خیر مشکل تھا
تیرا غم بھی جہاں نے چھین لیا

ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں فارسی زبان سے بھی کام لیا ہے۔فارسیت ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔انہوں نے بعض بہت ہی خوبصورت، برمحل، فارسی ترکیبوں کا استعمال کیا۔ان کے یہاں فارسی مزاج کی شائستگی اور پیچیدگی موجود ہے ؎

ہر سحر بارگاہ شبنم میں
پھول ملتے ہیں باوضو ہم سے

دم مہتاب فشاں سے ناصرؔ
آج تو رات جگا دی ہم نے

ناصر کی شاعری کے تعلق سے مظفر علی سید کہتے ہیں کہ ناصرؔ کی شاعری کو ایک نئے مکاں کی تعمیر اور ایک نئی زمین کی دریافت کے پس منظر میں دیکھنا ہے یا ایک اجتماعی واردات کی بازگشت کے طور پر دیکھا ہے۔:

چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

''کبھی ناصر کے لفظوں میں رگ عصر کا لہو خود بخود بولتا تھا اور اس کو یہ بات جتانے کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی۔آزادی کے وقت اور اس کے فوراً بعد اس کی آواز میں ہم سب کا تجربہ شامل تھا''۔(بحوالہ:علی جاوید،فکر وتحقیق۔ص:۱۱۴)

ہجرت کے واقعہ کے بعد ناصر کاظمی کے نفسیاتی رویے میں گہری تبدیلی آئی۔وہ ایک نئے ملک میں رہ کر بھی ذہنی اور جذباتی وابستگی قائم کرنے کی شعوری کوشش کے باوجود اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکے۔لاشعور کی یہ کارفرمائی ان کے رویے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے ؎

گئے دنوں کا سراغ لے کر کہاں سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

ناصر کاظمی کو صرف اپنے دکھ کا احساس نہیں ہے بلکہ وہ پورے قافلے کی بات کرتے ہیں۔انہیں پوری انسانیت، پورا قافلہ،منزل کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔یہ صورت حال ان کے شخصی کرب میں اضافے کا باعث بنتی ہے ؎

سفر ہے اور غربت کا سفر ہے
غم صد کارواں دیکھا نہ جائے

منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جما لیے ہیں ڈیرے

ناصر کاظمی کی شاعری اس دور کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کی رعنائیوں اور دہشت پسندیوں کا شعور عطا کرتی

ہے۔جوان کی ذات کے توسط سے منفرد تخلیقی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ان کی شاعری میں حددرجہ شخصی لہجے کے باوجود اجتماعی زندگی کا کرب اور دکھ ملتا ہے ؎

بازار بند راستے سنسان بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

ناصر کاظمی کی شاعری میں بہترین تشبیہات واستعارات ملتے ہیں۔ان کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تتلی کے پروں کی طرح ہے،ذرا سا ہاتھ لگائیں تو سارے رنگ میلے ہوجائیں گے۔حامدی کاشمیری نے صحیح لکھا ہے:

''ناصر کے اشعار منہ اندھیرے کھلے ہوئے پھول ہیں،جو اپنی تازگی،رنگ،خوشبو،جھلملاہٹ اور نوروسایہ کا سحر جگائے ہیں اور خیال وخواب کی جادوئی تصویروں میں جان ڈال دیئے ہیں''۔(بحوالہ:حامدی کاشمیری۔جدید شعری منظرنامہ)

ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں بہترین تلمیحات استعمال کی ہیں ؎

یوں ترے حسن کی تصویر غزل میں آئے
جیسے بلقیس سلیمان کے محل میں آئے

دیکھ کر چلو ناصرؔ
دشت ہے یہ فیلوں کا

ناصر کاظمی کی تشبیہات ملاحظہ کیجیے ؎

تیری ہلال سی انگلی پکڑے
میں کوسوں پیدل چلتا تھا

ایک رخسار پہ زلف گری تھی
اک رخسار پہ چاند کھلا تھا

ناصر کاظمی نے استعاروں کا استعمال نہایت خوبی سے کیا ہے استعارہ ان کے تجربہ کو غیر معمولی قوت بخشتا ہے ؎

تو جہاں چند روز ٹھہرا تھا
یادکرتا ہے تجھ کو آج وہ گھر
اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
ترا دیا جلانے والے کیا ہوئے

تقسیم ہند کے تغیرات نے جہاں شعروادب کو متاثر کیا،وہیں فنی سطح پر غیر معمولی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔جدید شاعری میں نہ صرف پرانی ترکیبوں،استعاروں اور علامتوں سے انحراف ملتا ہے بلکہ نئی علامتیں اختیار کرنے،الفاظ کو نئے معنی عطا کرنے اور نئے نئے تجربوں کو پیش کرنے کا عام رواج رہا ہے۔یہ رواج اس دور کے تقریباً سبھی شعراء کے یہاں کم وبیش دیکھنے کو ملتا ہے،لیکن ان سب میں ناصر کاظمی کے یہاں یہ رواج بہت زیادہ مقبول رہا ہے۔

ناصر کے ان اشعار میں علامت نگاری کا نمایاں انداز ملتا ہے ؎

اس بستی سے آتی ہیں
آوازیں زنجیروں کی

بھیگ چلیں اب رات کی پلکیں
تو اب تھک کر سویا ہوگا

ناصر کاظمی نے پیکر تراشی کا بھر پور استعمال کیا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں کئی ایک پیکر کو بروئے کار لایا ہے،جس کی وجہ سے ان کی شاعری ایک نئی آواز ایک نئے انداز سے ہم کنار ہوتی ہے ؎

گلی گلی میں مری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل
مجھ سے اتنی وحشت ہے تو میری حدوں سے دور نکل

الغرض ناصر کاظمی اردو ادب کے ایک بڑے شاعر گزرے ہیں ان کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ ان کی شاعری اور شخصیت سے لگایا جاسکتا ہے ؎

ڈھونڈیں گے لوگ مجھ کو ہر محفل سخن میں
ہر دور کی غزل میں میرا نشان رہے گا

ابوھریرہ یوسفی

اردو صحافت کا ماضی اور حال

صحافت کی تعریف:

صحافت عربی زبان وادب میں کتاب یا رسالے کو کہا جاتا ہے، اردو زبان کے اعتبار سے فیروز اللغات میں صحافت کا معنیٰ اخباری کاروبار اور اخبار نویسی لکھا ہوا ہے۔صحافت کی مزید تعریف کرتے ہوئے احمد اشفاق لکھتے ہیں:

''صحافت کسی خبر، حادثہ، کوئی اہم پیش رفت یا رونما ہونے والے کسی اہم واقعہ کو تحقیق اور تجزیہ کے ساتھ قارئین تک پہنچانے کے عمل کا نام ہے، بشرطیکہ اس سارے کام میں نہایت ہی ایمانداری اور اخلاص کا عنصر موجود ہو، صحافت نام ہے لوگوں کی رہنمائی کا، صحافت نام ہے تبصروں کے ذریعہ عوام الناس کو روشناس کرانے کا، صحافت عوامی معلومات، رائے عامہ اور تفریحات کی باضابطہ اور مستند اشاعت کا فریضہ ادا کرتی ہے، صحافت انسانی اقدار کے تحفظ کی ضامن اور مظلوم ومجبور عوام کے جذبات واحساسات کی ترجمان ہوتی ہے، صحافت کی قوت دراصل عوام کی قوت ہوتی ہے، کسی تحریک، جماعت یا حکومت کی پالیسی کی کامیابی وناکامی میں صحافت ایک اہم کردار ادا کرتی ہے''۔

(اردو دنیا، نومبر 2016 ص56)

اردو صحافت کی تاریخ:

اردو صحافت کی دوسوسالہ تاریخ رہی ہے۔ اردو صحافت کے آغاز کے سلسلے میں کئی تضاد باتیں لکھی گئی ہیں، کوئی محمد باقر کے سر اس کا سہرا باندھتا ہے، جو پہلے صحافی تھے، جنہوں نے آزادیٔ ہند کے لئے جام شہادت نوش کیا۔ کہا جاتا ہے کہ محمد باقر کے اردو اخبار کی اشاعت کا سلسلہ 1836 سے لے کر 1857 تک جاری رہا۔ بعض لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آگرہ اخبار اردو کا سب سے پہلا اخبار ہے، جو 1831 میں اکبر آباد سے شائع ہوا، جبکہ مورخین لکھتے ہیں کہ جام جہاں نما اردو کا پہلا اخبار ہے، جو 1823 کو جاری ہوا۔ یوسف کاظم کا دعویٰ ہے کہ مرأۃ الاخبار دراصل اردو کا پہلا اخبار ہے، جس کو 1821 میں کولکاتا سے راجا رام موہن رائے نے جاری کیا۔ ایک اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ کاظم علی نے اردو اخبار کے نام سے 1810 میں کولکاتا سے اردو صحافت کا آغاز کیا۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اردو صحافت کا آغاز حضرت ٹیپو سلطان علیہ الرحمہ نے 1794 میں کیا تھا، ان کے حکم پر ایک سرکاری پریس جاری کیا گیا، جس میں عربی حروف میں ٹائپ کی چھپائی ہوتی تھی، اس کے بعد انہیں کے حکم پر اسی پریس سے اردو زبان کا اخبار بنام فوجی اخبار جاری کیا گیا، اس اخبار کی عوام تک رسائی نہیں تھی، صرف شاہی فوجی افسران اور سپاہیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ جہاں عوامی اخبار کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز لکھتے ہیں:

''جام جہاں نما کو اردو اولین اخبار کی سند دی جاتی ہے، جس کے ناشر ہری دت اور ایڈیٹر سدا سکھ لعل تھے۔ جام جہاں نما کی مقبولیت اور اس کے مضامین سے پیدا ہونے والے جوش اور ولولہ کے پیش نظر برطانوی حکومت کے اس وقت کے چیف

سکریٹری ولیم ورلڈ وتھ بیلے نے ایک خفیہ فائل تیار کی تھی، جس میں جام جہاں نما پر کنٹرول کی ہدایت تھی۔ جام جہاں نما ہی کی وجہ سے 1823 میں پہلا پریس ایکٹ رائج ہوا''۔

تحریک آزادی میں اردو صحافت کا کردار:

ویسے جنگ آزادی سے پہلے ہی اردو صحافت کا بول بالا ہو چکا تھا۔ اردو صحافت نے انگریزی حکومت کے خلاف قلمی جہاد کیا، انگریز کی ظالمانہ پالیسی سے اردو صحافت نے عوام کو خوب روشناس کرایا، انگریز کے خلاف بے باک مضامین اخبارات میں برابر چھپتے رہے، جس کی وجہ سے عوام میں انقلاب اور جنگ آزادی کا جذبہ سر چڑھ کر بولنے لگا، اردو صحافت نے بلا مذہب وملت کے ہندوستانی عوام میں انقلاب کی ایک نئی روح پھونک دی، اسی جذبے نے 1857 میں انگریزوں کے خلاف معرکے پر مجبور کیا اور انگریز عوامی انقلاب کا ذمہ دار اردو اخبارات کو ٹھہراتے تھے، اسی وجہ سے انہوں نے کئی اخبار کو نہ صرف کالعدم قرار دیا، بلکہ صحافیوں کو شدید سزا دی گئی، گرفتاری کے وارنٹ جاری کئے گئے، مقدمہ چلایا گیا، کئی اخبارات کی ضمانتیں طلب کی گئیں، ان کی جائدادیں ضبطہ کی گئیں اور مکانوں پر قبضے بھی کئے گئے، حتی کہ کئی صحافیوں کو اس کی پاداش میں پھانسی دی گئی، اس کے باوجود اردو صحافت کی آزادی کی جدوجہد برابر جاری رہی، عوام کو حب الوطنی اور آزادی کا جذبہ دلاتے رہے۔ انہیں باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے پروفیسر ارتضی کریم رقمطراز ہیں:

''ماضی میں صحافت کی ایک درخشاں اور زریں تاریخ رہی ہے۔ صحافت نے جمہوری حقوق، مساوات، امن، سیکولرزم، اتحاد، یگانگت اور یکجہتی کے لئے جو کردار ادا کیا ہے، وہ ناقابل فراموش ہے، ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی صحافت کا بہت فعال انقلابی کردار رہا ہے، اردو صحافت نہ ہوتی تو ہندوستان کی آزادی کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوتا، ماضی کے زیادہ تر صحافیوں نے فرنگیوں کے خلاف جو محاذ کھولا تھا، اس کا ہندوستانی عوام کے شعور پر بہت گہرا اثر پڑا، آزادی اور انقلاب کے جذبے کو بیدار کرنے میں سب سے اہم رول اردو صحافت ہی کا رہا ہے''۔ (ہماری بات، اردو دنیا، دسمبر 2015)

صحافت کی اہمیت وافادیت:

اردو صحافت شروع ہی سے اہمیت وافادیت کی قابل رہی ہے اور آج اس کی اہمیت اس قدر مزید ہوگئی ہے کہ ہندوستان میں صحافت کو جمہوریت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے، اس لئے کہ صحافت کے ذریعہ بلند ہونے والی آواز حکومت تک پہنچتی ہے، جس کا اثر حکومت پر پڑتا ہے۔ صحافت عوام کی آواز ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ حکومت اور عوامی ادارے غیر جانب دارانہ صحافت کے احترام پر مجبور ہوتے ہیں، اسی طرح صحافت کسی حکومت، جماعت اور تحریک کی غلط پالیسی پر نظر رکھتی ہے، اس کے غیر دانشمندانہ کارناموں کو بے نقاب کرتی ہے۔ مذہبی لحاظ سے بھی صحافت اپنا اہم کردار ادا کر رہی ہے، ایک صالح معاشرہ کے لئے صحافت کی خدمات کافی اہم ہیں۔

اردو صحافت کا موجودہ معیار:

اگر تنقیدی نظر سے دیکھا جائے تو فی زمانہ اردو صحافت کا معیار کم ہو رہا ہے، جہاں دن بدن اردو اخبارات کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، وہیں صحافت کا معیار کچھ نہ کچھ زوال کی طرف بڑھ رہا ہے، دور جدید میں بہت ایسے اخبارات نکل رہے ہیں، جو گمنام ہیں، وہ اتنے کم تعداد میں چھپ رہے ہیں کہ عوام کو ان اخبارات کے نام تک معلوم نہیں ہیں، ایسے اخبارات صرف اشتہار کی خاطر موٹی رقومات کی لالچ میں نکل رہے ہیں اور ایسے اخبارات صرف مشتہرین اور سرکاری اداروں کو ہی دیا جاتا ہے، ایسے اخبارات کے لئے ملازم بھی نہیں رکھے جاتے ہیں، بلکہ مالکِ اخبار ایک دو کا سہارا لے کر پورا اخبار بھی تیار کر لیتا ہے اس لئے کہ اب پوری دنیا کی پل پل

کی اردو خبریں انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں، وہاں سے کاپی کے ذریعہ چند گھنٹوں میں ایک ہی آدمی پورا اخبار تیار کر لیتا ہے، اب اردو کے ایسے سافٹ ویئر بھی آ گئے ہیں کہ اب کمپیوزنگ کی بھی ضرورت نہیں پڑتی ہے، صرف کاپی پیسٹ سے کام چلایا جاتا ہے، ایسے اخبارات میں غلطیاں بے شمار پائی جاتی ہیں۔ اب نامہ نگاروں کی تعداد بھی کم ہو رہی ہے، ان کی جگہ انٹرنیٹ نے لے لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ بیشتر اخبارات میں خبریں ایک جیسی رہتی ہیں، کچھ علاقائی خبروں میں تبدیلی رہتی ہے، لیکن عالمی اور کھیل کی خبریں تقریباً ہر اخبار سے ٹکراتی ہیں، بلکہ بسا اوقات عنوان اور سرخی بھی۔ اسی وجہ سے ایک قاری اخبار کی نگاہ میں دوسرا اخبار معیاری محسوس نہیں ہوتا ہے، جب سبھی اخبارات کی خبریں متصادم ہوں گی تو ایک ساتھ دو تین اخبارات خریدنا پیسے کو ضیاع کرنے جیسا ہوگا، اسی لئے اب بہت کم ایسے لوگ ہیں جو ایک ساتھ متعدد اخبارات کو خریدتے ہیں، حالانکہ اگر ایڈیٹران چاہیں تو خبروں میں تبدیلی کر کے دوسرے اخبار سے جدا کر سکتے ہیں، لیکن ایسا نہیں کیا جاتا ہے، زیادہ تر انٹرنیٹ کی بدولت کاپی پیسٹ پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

اردو اخبارات کے معیاری نہ ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اب تربیت یافتہ صحافیوں کی کمی ہے، زیادہ تر ایسے صحافیوں کو کم تنخواہ پر رکھا جاتا ہے، جن کو صحیح طریقے سے خبر بھی بنانی نہیں آتی، رہی بات مضبوط صحافیوں کی کم یابی، تو ان کو خاطر خواہ اجرت نہیں مل پاتی ہے، وہ مجبوراً دوسرے پیشے کو اختیار کر لیتے ہیں، اسی وجہ سے اردو تعلیم یافتہ طبقے کی صحافت سے توجہ دور ہو رہی ہے اور دن بدن اردو اخبارات تجربہ کار صحافیوں سے محروم ہو رہے ہیں۔

صحافت کا غلط استعمال:

کچھ لوگ اپنی سیاست کے لئے صحافت کا بھی استعمال کر رہے ہیں، چنانچہ کئی ایسی پارٹیاں ہیں، جو اپنا ذاتی اخبار نکالتی ہیں، جس کے ذریعہ اپنی پارٹی کا قد لمبا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ایسے اخبارات میں اپنی پارٹی کے متعلق خبریں زیادہ رہتی ہیں اور مخالف پارٹی کے تعمیری و تعریفی کارناموں پر مشتمل خبروں کو جگہ نہیں دی جاتی ہے، بلکہ اس کی ہجو میں خبروں کو ترجیح دی جاتی ہے، ایسے اخبارات میں بطور صحافی کارکنان کو آزادی نہیں ہوتی ہے، ان کی سوچ و فکر اور قلم ہمیشہ پارٹی کی غلام رہتی ہے۔

آج کل اردو صحافت میں مذہبی و مسلکی تعصب بھی جنم لینے لگا ہے، کئی اخبارات اس بیماری کا شکار ہیں، کسی ایک مکتبہ فکر کی معمولی خامیوں کو بڑھا چڑھا کر صفحہ اول پر جگہ دے دی جاتی ہے، سخت اور نامناسب الفاظ کے ذریعہ اس مسلک کو داغدار اور اس کے حامیوں کو مجروح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، موجودہ زمانے میں ایسے کئی واقعات درپیش آ چکے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس اخبار کے خلاف احتجاج ہوتا ہے، بلکہ کاپیاں بھی جلائی جا چکی ہیں، صحافیوں کے خلاف نفرت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ جعلی خبریں بھی پیش کر دی جاتی ہیں، کسی کے مثبت بیان کو منفی لکھ دیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض اردو اخبارات سے لوگوں کا اعتماد اٹھ رہا ہے اور یقیناً اس عمل سے اردو صحافت کی پاکیزگی داغدار ہوگی۔ صحافت کے اسی مسائل پر نظر رکھتے ہوئے حقانی القاسمی لکھتے ہیں:

''صحافت میں اخلاقیات کی جگہ اب صارفیت نے جگہ لے لی ہے، جس کی وجہ سے صحافت کا انسانی چہرہ مسخ ہو گیا ہے، آزاد اور شفاف صحافتی قدروں کی خلاف ورزی عام ہے، لوگ کہنے لگے ہیں کہ صحافت اب خبروں کی تجارت بن گئی ہے اور تجارتی مفادات کا تحفظ ہی صحافت کا مقصد اولین بن گیا ہے''۔

جدید ٹکنالوجی اور اردو صحافت:

جدید سائنسی ایجادات کی بدولت برقی صحافت کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے، جدید ٹکنالوجی کی آمد سے اردو صحافت نے بھی کافی ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ سب سے پہلے روزنامہ

سیاست حیدرآباد نے انٹرنیٹ ایڈیشن شائع کیا اور آج ہندوستان کے تقریباً ہر اردو اخبارات انٹرنیٹ پر شائع ہو رہے ہیں، لیکن یہ سب کے سب تصویر کی شکل میں پورے صفحات انٹرنیٹ پر اپلوڈ کر دیئے جاتے ہیں، جس کو پڑھنے میں دقت ہوتی ہے، اگر یونی کوڈ اردو کے ذریعہ شائع کئے جائیں تو جہاں اس کی اہمیت دوبالا ہو جائے گی، وہیں پڑھنے میں بھی آسانی ہوگی۔ اس کے علاوہ آن لائن اردو اخبارات بھی کثرت سے نیٹ پر شائع ہوتے ہیں، جن میں بطور خاص روزنامہ خوشبو منو، یو این اے نیوز، بصیرت آن لائن، فکر وخبر، ملت ٹائمز، اردو نیٹ جاپان، عالمی اردو اخبار، ای زمانہ اردو، القمر آن لائن قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ آن لائن اخبارات آسانی سے انٹرنیٹ پر پڑھے جاسکتے ہیں، اس لئے یہ سبھی یونی کوڈ اردو کے ذریعہ شائع ہوتے ہیں، ان میں اکثر اخبارات کے اپلی کیشن بھی آگئے ہیں، جس کو اب ہم اسمارٹ فون میں ایک اپلی کیشن کے ذریعہ ایک مکمل اردو اخبار کا مطالعہ کر سکتے ہیں، یہ تمام اخبارات سوشل میڈیا سے بھی مربوط ہیں، لیکن ہمارے ہندوستان کے مشہور اخبارات سوشل میڈیا پر زیادہ متحرک نہیں ہیں، اور جو موجود ہیں تو وہ پابندی سے سوشل میڈیا پر شائع نہیں کئے جاتے ہیں، اگر کئے بھی جاتے ہیں تو اسی بڑے صفحات کو تصویری شکل میں اپلوڈ کر دیئے جاتے ہیں، جس کو آسانی سے پڑھا بھی نہیں جاسکتا، جبکہ پاکستان کے سبھی اردو اخبارات، جہاں گوگل پر یونی کوڈ اردو کے ذریعہ شائع ہوتے ہیں، وہیں سوشل میڈیا پر بھی برابر پوسٹ کیئے جاتے ہیں، اس لئے ہندوستانی اردو اخبارات کو سب سے پہلے گوگل پر تصویری اردو کے بجائے یونی کوڈ کے ذریعہ دینا چاہئے، اور اسی طرح سوشل میڈیا پر بھی، تاکہ اردو صحافت جدید ٹکنالوجی سے مزید ہم آہنگ ہو اور جب ایسا ہوگا تو اس کا وقار بھی بلند ہوگا، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم برقیاتی ٹکنالوجی کے ذریعہ اردو صحافت کو فروغ دیں تاکہ اس جدید ٹکنالوجی کے دور میں دوسری زبانوں کی صحافت کی طرح اردو صحافت کا بھی وقار اور معیار بلند ہو اور اردو ورقی صحافت کو برقی صحافت سے مربوط کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

نذیر نادر، حیدرآباد

غزل

ستم کب تک کرو گے تم، کرم بھی کچھ کئے جاؤ
اندھیرے بانٹنے والو، اجالے بھی دیئے جاؤ
سنو اے قافلے والو! بڑا ہے پرخطر صحراء
ہمیں تنہا نہ چھوڑو ساتھ ہم کو بھی لیے جاؤ
نہ بھولے تم کو یہ سارا جہاں صبح قیامت تک
زمانے میں کچھ ایسے کارنامے تم کئے جاؤ
نگاہوں میں، دلوں میں نور آئے گا حقیقت کا
مری ساقی کے آنکھوں سے مئے عرفاں پیئے جاؤ
یہاں رازوں کو رازوں کی طرح رکھنا اگر چاہو
لبوں کو سوزنِ ضبط وتحمل سے سیئے جاؤ
شرافت سے نہیں ملتا جہاں انصاف تو اس جا
اٹھو مل کر شجاعت سے تم اپنا حق لئے جاؤ
پریشاں حال لوگوں کو یہی پیغام ہے نادر
نہ گھبراؤ مصائب سے اٹھا کے سر جیئے جاؤ

ڈاکٹر غوثیہ بانو

اسناد کی اہمیت

خلیفہ وقت سے بادشاہت کی سند حاصل کرنا حکمراں ضروری خیال کرتے تھے۔ اس سے ان کی حیثیت باضابطہ اور قانونی ہو جاتی تھی۔ مغل شہنشاہ خود کو خلیفہ متصور کرتے تھے۔ لیکن متعدد حکمرانوں نے خلیفہ وقت سے اس کی توثیق حاصل کی تھی۔ سلطان التمش اور محمد غزنوی نے اپنی تخت نشینی کی توثیق بغداد کے عباسی خلفا سے کرائی تھی اور محمد بن تغلق فیروز شاہ تغلق نے مصر کے عباسی خلفا سے سند حاصل کی تھی۔

میسور کے حکمراں ٹیپو سلطان نے مغل شہنشاہ شاہ عالم کے دربار سے سند حاصل نہ ہونے پر قسطنطنیہ کے عثمانی خلیفہ سے سند حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنا سفارتی مشن روانہ کیا۔ ٹیپو سلطان کو سلطان ترکی سے ''سند شاہی'' عطا کی گئی، جس کی رو سے انھیں خود مختار بادشاہ کا لقب اختیار کرنے، اپنا سکہ جاری کرنے اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوانے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔[1]

میر قمر الدین علی خان نظام الملک کو محمد شاہ شاہ دہلی کی جانب سے ''آصف جاہ'' کا خطاب اور دکن کی صوبہ داری عطا کی گئی تھی۔ خطابات اور مناصب کی روایت کو مغل شہنشاہی کے بعد ہندوستان پر حکمراں برطانوی شہنشاہیت نے قائم رکھا۔ حکومت برطانیہ کی توثیق دیسی ریاستوں کے لیے ضروری تھی۔ اگر یہ نہ ہو تو ریاست کو ضبط کرنے کا اچھا موقع فراہم ہو جایا کرتا تھا۔ سند اس بات کی ضمانت نہیں تھی کہ ریاست محفوظ ہو گئی ہو۔ ۱۸۵۷ء میں ضبط شدہ واجد علی شاہ کی حکومت اودھ ایک منظور شدہ حکومت تھی۔ اس کے باوجود حکمراں اور حکمرانی کے لیے اس وقت حکومت برطانیہ کے نمائندے کا اس کی سند نشینی کو قبول کرنا اس کی بادشاہت کا جواز فراہم کرنا تھا۔ میر عثمان علی خان کی ۲۹/ اگست ۱۹۱۱ء کی سند نشینی پر مبارک باد اور ان کے والد کے انتقال پر تعزیت ادا کرتے ہوئے وائسرائے ہند گورنر جنرل براؤن ہارڈنگ (Baron Harding) نے ۲۸/ ستمبر ۱۹۱۱ء کو ایک خط لکھا۔

اس خط سے حکومت برطانیہ کے آصف سادس اور آصف سابع کے تعلقات واضح ہوتے ہیں۔

آصف جاہی سلطنت کے بانی میر قمر الدین نظام الملک آصف جاہ اول سے وابستہ ایک روایت سے متعلق مورخین کا خیال ہے کہ وہ جب دکن کا رخ کرنے لگے تو انھوں نے ایک بزرگ شاہ عنایت سے دعا کی درخواست کی جس پر شاہ صاحب نے انھیں سات کلچے عنایت فرمائے اور سات پشتوں تک ان کی بادشاہت کی خوش خبری سنائی۔ آصف جاہ نے دعاؤں کے فیض کی یاد میں حیدرآباد میں ''بازار شاہ عنایت گنج'' بنوایا۔ جس کی آمدنی سے شاہ عنایتؒ کے خانوادے کی اولاد مستفید ہوتی رہیں۔ ان کلچوں سے متعلق نواب سرور جنگ نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ ''شاہ عنایت کے کلچے شاہی خزانے میں محفوظ تھے اور آصف جاہ سادس میر محبوب علی خان جب کبھی سفر کے لیے باہر تشریف لے جاتے تھے تو اس وقت یہ ''کلچے'' نکالے جاتے تھے۔''

دوسری روایت کے مطابق بعض مورخین نے حضرت نظام الدینؒ اورنگ آبادی اور بعض نے شاہ عنایت اور ڈی۔ ایف۔ کراکا نے اپنی کتاب ''دی فیبولس مغل'' میں ایک بزرگ لکھا ہے۔ جن سے یہ واقعہ منسوب کیا جاتا ہے کہ انھوں نے آصف جاہ اول کو اپنے دسترخوان پر کھانے کے لیے کہا، انھوں نے سات کلچے کھائے۔ جس پر انھیں سات پشتوں تک

بادشاہت کی بشارت دی گئی۔[۲]

۴/ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ م ۲۶/ اکتوبر ۱۹۱۴ء کے ایک فرمان میں کلچے سے متعلق روایت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس فرمان سے بزرگ کا نام واضح نہیں ہوسکا اور ''عنایتی کلچہ'' کے الفاظ سے یہاں مراد عنایت کردہ یا بزرگ عنایت شاہ کی جانب سے عطا کردہ واضح نہیں ہو پایا۔

۱۹۱۴ء کا زمانہ پہلی جنگ عظیم کی شروعات کا وقت تھا۔ ہندوستان میں سودیشی تحریک کا زور تھا۔ انتہا پسند جماعتوں (Extremist) کو قائم کیا جارہا تھا۔ انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں آزادی اور قومیت کا جذبہ پروان چڑھ رہا تھا برطانوی حکومت کے خلاف بڑھتی بے اطمینانی کے باوجود ہندوستانی لیڈروں کی ایماء پر لاکھوں ہندوستانی فوج میں بھرتی ہوئے۔[۳]

اس موقع پر اپنی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد ہی اس عالمی جنگ کے موقع پر اپنی ریاست کی رعایا سے اپیل کرتے ہوئے آصف سابع حکومت برطانیہ کو بہترین دوست اور حمایت ونگہداشت کرنے والی قرار دیتے ہیں۔ جس کی استقلال و وفاداری کے ساتھ اطاعت کو وہ ضروری خیال کرتے ہیں اور وہ خود اپنی ریاست کی قوت و دولت کو برطانیہ عظمی کی حمایت میں صرف کرنے میں آمادہ ہے۔

اس فرمان میں ایک نئے حکمراں کے لہجے کا تحکم بالکل واضح ہے۔ حالات پر قابو، ریاست کی قوت، رعایا کا اعتماد تمام چیزیں برسر اقتدار طاقت کے ہاتھوں میں ہے۔ جو فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور اسے ماننا واجب ولازم جانتا ہے۔ لیکن یہ صورت حال دوسری جنگ عظیم تک یکسر تبدیل ہوگئی۔ اس دور کے فرامین سے ہمیں اس کا اندازہ لگانا مشکل امر نہیں ہے۔

جنگ میں شرکت کرنے والے مختلف محکمہ جات کے ملازمین کی رخصت منظور کی گئی ساتھ ہی نصف تنخواہ دیے جانے کا حکم دیا گیا۔ ۵/ صفر المظفر ۱۳۳۳ھ کی ایک عرضداشت پر حکم دیتے ہوئے ایک فرمان جاری کیا گیا جس میں مہتمم آبپاشی ضلع نلگنڈہ کے ''مسٹر ہرسٹ اٹلی'' کی رخصت فوج میں بہ حیثیت والنٹیر شریک ہونے کے لیے منظور کی گئی ساتھ ہی زمانہ شرکت جنگ کے بابتہ نصف تنخواہ دینے کا حکم صادر کیا گیا۔

۲۴/ ستمبر ۱۹۲۱ء کے ایک اور فرمان سے آصف سابع کی حکومت پر گرفت اور ریاست کے لیے طویل منصوبہ بندی کی کوشش صاف نظر آتی ہے۔ یہ فرمان صیغہ فینانس کی اس عرضداشت کے حکم میں جاری کیا گیا جو نظامت جنگ نے ارکان باب حکومت کی رائے کے ساتھ پیش کی ہے۔ اس میں سرکاری ضرورتوں کے لیے پبلک سے باجرائی پرامیسری نوٹس قرضہ سودی چھ فی صد لینے کی نسبت درخواست کی گئی ہے۔ جس پر حکم دیتے ہوئے کہا گیا کہ یہ قرض حسب شرائط لیا جائے اور اس قرضہ کو تیس یا بیس سال بعد ادا کرنے کے لیے ہر سال کے موازنہ (بجٹ) میں رقم پس انداز ہوگی، جس کی اطلاع دی جاتی رہے۔

میر محبوب علی خان کے دور حکومت میں ملک کی حکومت کو بہتر طریقے پر کارکرد رکھنے کے لیے سرکاری عہدہ داروں اور غیر سرکاری اراکین کے اشتراک سے ایک وضع قوانین مجلس ۱۸۹۳ء میں قائم کی گئی جس کے ذمہ مشورہ اور بحث کے بعد قوانین وضع کرنے کے بعد اسے آصف سادس کی منظوری کے بعد نافذ کیا جائے۔[۴] ۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ہندوستان کے نظام حکومت میں اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ صوبوں کے نظام حکومت میں بنیادی تبدیلی کی گئی حکومت کے بعض منتخبہ وزیروں کو بعض محکمے سپرد کیے گئے۔ یہ وزراء مجلس قانون ساز (Legislative Council) کے روبرو اپنی پالیسی اور کاموں کے لیے جوابدہ وذمہ دار ہوتے تھے۔ گورنر کی ایگزیکٹیو کونسل کے دیگر ممبران کو اہم محکمے مالیات

پولیس (Finance Law & Order) وغیرہ سپرد کیے جاتے جس کے لیے وہ کونسل کے سامنے جواب دہ نہ ہوتے اس طرح صوبوں میں ایک ذمہ دار دوعملی (Dyarchy) حکومت شروع ہوئی۔۵

ریاست حیدرآباد میں ۱۷/ نومبر ۱۹۱۹ء کو جدید دستور اساسی کے نفاذ کے ساتھ ایک فرمان کے ذریعہ ''باب حکومت'' کی تاسیس عمل میں آئی۔ باب حکومت میں ایک شاہی خاندان کے رکن کے علاوہ سینیئر اور تجربہ کار عہدہ دار ہوتے، اس میں مسلم، ہندو، پارسی اور انگریز بھی شامل ہوتے۔ اراکین باب حکومت (جنھیں صدرالمہام کہا جاتا) کا تقرر رئیس وقت کی مرضی اور باب حکومت کے صدر اعظم کی رائے سے ہوتا۔ یہ اراکین رئیس وقت کے روبرو ذمہ دار ہوتے۔ باب حکومت کی تمام کارروائیوں کے لیے صدر اعظم کی حیثیت صدر کی تھی جن کی اجازت سے صدرالمہام فیصلوں کے مختار ہوتے۔ چیف سیکریٹری جملہ وزارتوں سے پیش ہونے والی کارروائیوں کو باب حکومت میں پیش کرنے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔۶ اراکین کونسل کے انتخاب کے علاوہ ان کی تنخواہ اور وظیفہ مقرر کرنے کا اختیار مکمل طور پر آصف سابع کو حاصل تھا جسے وہ کسی قاعدہ سے محدود نہیں کرنا چاہتے تھے۔

صیغۂ فینانس کی ۲۳/ ذی قعدہ ۱۳۴۵ھ کی ایک عرضداشت جو تلاوت جنگ (رکن کونسل) کے وظیفہ سے متعلق ہے۔ اس پر حکم صادر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تلاوت جنگ کو جملہ ایک ہزار روپے کا وظیفہ تاریخ علاحدگی سے دیا جائے۔ ارکان کونسل کی تنخواہ اور وظیفہ کا تصفیہ ہر وقت پورے طور سے میرے اختیار میں رہا ہے۔ یہ اختیار کوئی نظیر یا قاعدہ سے محدود نہیں ہوسکتا۔ (۲۷/ ذی قعدہ ۱۳۴۵ھ م ۲۱/ مئی ۱۹۲۷ء)

وہ ارکان کونسل کی تنخواہ و وظیفہ کے معاملہ کو اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن شخصی حکومت کے بجائے کونسل کے مشوروں سے کارکرد حکومت کو ترجیح دیتے تھے۔

حکومت تلنگانہ
محکمہ اقلیتی بہبود
تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی حیدرآباد

تقررات برائے اردو آفیسرس گریڈ۔II

اعلامیہ نمبر 2018/2 مورخہ: 28 مارچ 2018ء

مختلف سرکاری محکمہ جات میں اردو آفیسرس گریڈ۔II کی جائیدادوں پر تقررات کیلئے تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کی جانب سے درخواستیں مطلوب ہیں۔

عہدہ	جائیدادیں	اہلیت	طریقہ انتخاب
اردو آفیسر گریڈ۔II اسکیل 28,940 تا 78,910 روپئے	60	(الف) گرائجویشن یا مماثل ڈگری معہ اردو بحیثیت ایک مضمون (ب) ایس ایس سی / میٹریکولیشن یا مماثل کامیاب معہ تلگو بحیثیت زبان دوم	تحریری امتحان

عمر : یکم جولائی 2018ء کو 21 تا 44 سال کے درمیان

رجسٹریشن فیس : مبلغ -/500 روپئے آن لائن ادائیگی۔ البتہ ریاست تلنگانہ کے متوطن SC/ST/PH اور سابق فوجی فیس کی ادائی سے مستثنیٰ رہیں گے۔

امیدوار اپنی درخواستیں 2 اپریل 2018ء تا 23 اپریل 2018ء صرف آن لائین داخل کرسکتے ہیں۔ مزید تفصیلات کیلئے ویب سائیٹ www.tsua.in ملاحظہ فرمائیں۔

ڈائرکٹر تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی

ڈاکٹر سراج احمد انصاری

'نالۂ شب گیر': احتجاج کا نیا انداز

اکیسویں صدی کے ۲۰۱۴ میں شائع ناول 'نالۂ شب گیر' میں تانیثی احتجاج کی کہانی مرقوم ہے یہ کہانی ایک ایسی عورت پر منحصر ہے جو ظلم و جبر اور استحصال کے آگے سر نہیں جھکاتی ہے بلکہ اس سے ہمت سے مقابلہ کرتی ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے سماج میں ہو رہی تبدیلی کو محسوس کیا ہے اور اسے ناول کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں عورتوں پر ہونے والی ظلم و زیادتی، استحصال، ایک لڑکی کا اپنی شرطوں پر زندگی گزارنا اور تبدیل ہوتی تہذیب کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں واقعات دلچسپ، پلاٹ باترتیب اور مربوط، کردار زندہ اور مثالی، متوسط طبقہ اور تعلیم یافتہ ماحول، نیچرل اور موزوں مکالمہ اور غم و نشاط دونوں طرح کی جذبات موجود ہیں۔ یہ ہر اس لڑکی سے منسوب ہے جو باغی ہے اور اپنی شرطوں پر زندہ رہنا چاہتی ہے۔ نام، نعمان شوق کے شعر۔ کوئی تو نالۂ شب پہ باہر نکلے.....کوئی تو جاگ رہا ہوگا دیوانے کے سوا۔ سے موسوم ہے۔ اس سے قبل ذوقی کے ایک اہم ناول کا نام ''لے سانس بھی آہستہ'' میر کے شعر۔ لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام.....آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا۔ سے ماخوذ ہے۔ متذکرہ بالا دونوں ناول اردو ادب میں منفرد مقام اور نئے تجربے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ناول زندگی کے تجربات پیش کرنے کے ساتھ سماج کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ ناول نگار کے تجربات و مشاہدات ہی ناول کا اصل مواد ہوتے ہیں۔ مصنف جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسے ناول کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ اس کے مطالعات و مشاہدات جتنا عمیق ہونگے، ناول کی معنویت میں بھی اسی قدر گہرائی و گیرائی ہوگی۔ انفارمیشن ٹکنالوجی نے پوری دنیا کو ایک گلوب کی مانند بنا دیا ہے۔ ایک جگہ بیٹھ کر پوری دنیا کا مشاہدہ کرنا آسان ہو گیا ہے۔ ایک جگہ کی ادب و ثقافت دوسرے ممالک کی تہذیب و معاشرت پر بڑی تیزی سے اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اردو ادب میں بھی آئے دن نئے موضوعات شامل ہو رہے ہیں، جن کے چند گوشوں کو مشرف عالم ذوقی نے اپنے ناول ''نالۂ شب گیر'' میں پیش کیا ہے۔

ذوقی نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ناول کا اہم حصہ لڑکیوں کے استحصال سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک مہذب خاندان، جہاں لوگ نمازی، معاشرے میں عزت، گھر میں پردہ اور پرہیزگاری کی شہرت ہے۔ وہاں لڑکیوں کی تعلیم اور گھر سے باہر قدم نکالنے پر پابندی ہوتی ہے۔ خاندان والوں کو یہ خوف ہوتا ہے کہ گھر کی عزت نیلام اور بزرگوں کی شان میں کمی نہ لاحق ہو جائے۔ لیکن گھر اور پردے کے اندر کس طرح ان کا استحصال ہوتا ہے اس کو بیرونی دنیا نہیں جانتی۔ اور کبھی علم ہوتے ہوئے بھی لوگ ایسی باتوں کو مخفی رکھنا بہتر سمجھتے ہیں۔ ایک حساس مصنف، جس کی نظر نہ صرف پردے کے باہر جاتی ہے بلکہ اندر کی چیزوں کا بھی مشاہدہ کر لیتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''جونا گڑھ کا ایک بڑا سا حویلی نما مکان.....ایک ابو تھے۔ انتہائی سخت، نمازی، پرہیزگار۔ غصہ آتا تھا تو صرف اماں پر۔ اور اماں پر آئے غصے کے لئے انہیں

کسی وجہ کی ضرورت نہیں تھی۔ گھر میں پردے کا رواج تھا۔ باہر جانے پر پابندی تھی۔ لیکن رشتے داروں کی فوج تھی، آئے دن جن کا حملہ ہوتا رہتا تھا..... اب تو شکلیں بھی بھولنے لگی ہوں۔ اجو ماموں، گبرو دادا، چینو چاچا..... سبحان بھائی، تختے والے عمران چاچا..... سفید داڑھی والے ابو چاچا..... زیادہ تر داڑھیوں والے بلکہ خوفناک داڑھیوں والے بزرگ..... یہ حویلی ہماری تھی تو ان کی بھی تھی..... میری عمر ہی کیا تھی۔ مگر میں جیسے مرغی کے دربے میں ہاتھ بڑھا کر کسی مرغی کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیتی، ایسے ہی یہ لوگ پیار کے بہانے مجھے بھی دبوچ لیتے۔ کیوں دبوچتے، یہ بات میری سمجھ میں پہلے نہیں آئی تھی۔

پھر مرغیوں کی کڑکڑاہٹ کے ساتھ ننھی معصوم آوازیں لنگیوں اور پاجاموں کیسرسراہٹ میں کھو جاتیں۔

ماموں چھوڑو نا..... جانے دو نا.....

ابو چاچا..... کیا کرتے ہو..... جانے دو..... نا.....

گبرو دادا..... میں اماں سے کہہ دوں گی..... تم بہت گندے ہو.....

چھوڑو نا.....

دکھ رہا ہے.....

جانے دو.....

یہ بچوں سے پیار کے کھیل تھے جو ابو اور اماں کے سامنے بھی کیے جاتے تو بچوں کا لاڈ اور پیار نظر آتا۔''[1]

اس موضوع کو ایک فلم ''ہائیوے'' میں بھی پیش کیا گیا ہے جس میں لڑکی ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ کسی رنجش کی بنا پر ہیرو اس لڑکی کو اغوا کرنے کے بعد بہت دنوں تک اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اس کا مقصد پیسے حاصل کرنا ہوتا ہے نہ کہ لڑکی کے ساتھ بدسلوکی کرنا۔ آہستہ آہستہ لڑکی کو اغوا کرنے والے شخص سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ اس کو گھر جانے کی ضد کرتا ہے لیکن وہ واپس جانے کو تیار نہیں ہوتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اس گھر میں میں پھر سے مرنے نہیں جانا چاہتی۔ لوگ اس گھر میں لاڈ، پیار، کے ذریعہ استحصال کرتے ہیں۔ وہاں رہنے والے، انسان نہیں، حیوان ہیں حیوان !۔ وہ اپنے کسی پاپا کے ملنے والے کا ذکر کرتی ہے جو اس کے گھر آیا کرتے تھے، ٹافیاں لاتے، ٹافیاں کھلا کر باتھروم میں لے جاتے، چلانے پر منھ دبا دیتے اور کہتے 'کسی سے نہیں کہنا'۔ اس بات کی شکایت وہ اپنی ماں سے کرتی تو وہ بھی کسی سے نہ کہنے کا حکم دیتی۔

مقالہ تحریر کرتے وقت یو۔ ٹیوب پر لتا حیا کی ایک نظم سنا جس میں ایک بند اس موضوع سے تعلق رکھتا تھا۔ مثال ملاحظہ فرمائیں:

''اِک بچی گھر میں اپنے محفوظ نہیں رہ پائے گی
بھول گئے ہم ہندوستانی ہر تعلیم شرافت کی
سیکھ رہے ہیں مغرب کی ہم a,b,c,d,e,f,g
اب نہ کوئی شرم رہی رشتوں میں اور نہ مریادہ
بیٹی کو لوٹے والد اور پوتی کو لوٹے دادا
اور بہن پر بھائی کی نظروں کے چلتے وار ہیں
اس ساری بے شرمی کے ہم خود بھی ذمہ دار ہیں''[2]

جب لتا حیا ان اشعار کو پیش کر رہی تھیں تو لوگ معمول کے مطابق حظ حاصل کر رہے تھے۔ شاید کسی کو اس بات کی فکر تھی یا نہ تھی کہ اگر ہمارے معاشرے میں ایسی چیزیں موجود ہیں یا پیدا ہو رہی ہیں تو ہمارے سماج کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

بالا تین مثالوں کو پیش کر کے تقابلی مطالعہ پیش کرنا مقصد نہیں تاہم یہ بتانا تھا کہ مصنف نے جس موضوع کو بروئے کار لایا ہے ایسی باتیں ادب میں ہونے لگی ہیں۔ لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ اردو ادب میں قدرِ اس قسم کے ناولوں یا اس قسم کی کہانیوں پر مبنی ناولوں کو اردو ادب میں مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ کیوں کہ ابھی تک مسلم معاشرہ اس

ناپاکی سے محفوظ ہے۔ یکا دوکا واقعات اگر رونما ہوتے بھی ہیں تو وہ علم کی ناشناسی کی وجہ سے۔اس لیے نالۂ شب گیر کی کہانی کو اچھا تصور نہیں کیا جاتا۔تاہم یہ بھی واضح ہے کہ ناول نگار کسی مخصوص معاشرے کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظر میں ہر طبقہ اور تہذیب کے لوگ ہوتے ہیں۔ ناول میں مظلومہ،ظلم و زیادتی اور استحصال کا شکار ہو کر خاموش نہیں رہتی بلکہ سماج اور معاشرے سے بغاوت کرتی ہے۔جھوٹی تہذیب اور پردے کو چاک کر کے باہر نکلتی ہے، اپنی تعلیم کے لیے جدو جہد کرتی ہے اور ہونے والے جبر کے آگے سرخم کرنے کے بجائے خود کے اندر لڑنے کی قوت پیدا کرتی ہے۔

ناول کی ابتدا صوفیا مشتاق سے ہوتی ہے لیکن اس سے قبل مصنف کچھ کر اس لائنیں کھینچتا ہے اور وقت کے فلسفے کو پیش کرتا ہے۔اس کے مطابق ہر چیز، ہر لمحہ تغیر پزیر ہے۔ نگاہوں نے ابھی جن اشیاء کو دیکھا ہے یہ ممکن ہے کہ چند لمحے بعد ان کی شکلیں تبدیل ہو جائیں۔ با الفاظ دیگر کسی صحرا سے گزرتے وقت آپ کی نظر کسی مکان پر پڑی ہو ممکن ہے لوٹیں تو وہاں ایک پورا شہر آباد ہو۔اقتباس:

> ’’لکھتے ہوئے احساس ہوا، یہاں ہر لمحہ ایک نئی دنیا بن جاتی ہے اور اوپر جو کچھ لکھا، وہ سب ماضی کا حصہ، بیکار یا واہیات ثابت ہو چکا ہوتا ہے۔میری اس بات کو اس طرح سمجھیں کہ ابھی ایک زمین کے، ایک خالی حصہ کو کراس کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں اور واپس آتے ہیں تو یہاں ایک نیا شہر آباد رہتا ہے۔‘‘[۳]

جس فلسفے کو مصنف نے پیش کیا ہے اسے فطری طور پر ناول میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ناول میں ایک کردار مصنف کا بھی ہے جو ہر جگہ موجود ہوتا ہے ۔مصنف کی پہلی ملاقات جس شخص سے ہوتی ہے اس کے عادات و اطوار کچھ اور ہوتے ہیں لیکن دوسری ملاقات میں اس کے حالات، نام وغیرہ سب کچھ تبدیل نظر آتے ہیں۔

ناول کا قصہ صوفیا مشتاق سے شروع ہوتا ہے۔ وہ دیواروں پر آویزاں بڑے بڑے کیڑوں کا ذکر کرتی ہے ۔وہ اس کے کمرے میں آتے ہیں اور اس کی گردن سے خون چوستے ہیں۔صوفیا، والدین کے انتقال کے بعد اپنی بہن اور بہنوئی کے پاس رہتی ہے۔ یہاں بھی وہ محفوظ نہیں رہ پاتی، اپنے بہنوئی کی بدنظری کا شکار ہو جاتی ہے۔جب اس کی گفتگو مصنف سے ہوتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ’انسان سے بڑا جانور کون ہے صاحب۔‘اس بات کی پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذوقی نے اس طرح کی سماجی برائیوں سے متاثر ہو کر ناول کا تانا بانا تیار کیا ہے ۔دراصل انسانوں کی جنسی بھوک اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس کی شکل جانور اور کیڑوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے ۔

صوفیا مشتاق کے ذریعہ ایک بڑی برائی کو پیش کیا گیا ہے جو جہیز کی شکل میں ہمارے معاشرے میں موجود ہے ۔صوفیہ مشتاق پڑھی لکھی ایک خوبصورت لڑکی ہے۔لیکن اس کی شادی نہیں ہو پاتی کیوں کہ اس کے بے روزگار بھائی کے پاس لڑکے والے کو دینے کے لیے پیسا نہیں ہے۔آخر کار اس کے گھر والے اس کی عقد کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کے اوپر بوجھ بننے کے اندیشے سے کہیں چلی جاتی ہے۔ یہ خرابی ہمارے سماج کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ دیگر ناولوں کی طرح اس میں بھی مرکزی اور ذیلی کردار ہیں ۔صوفیا مشتاق، ناہید ناز، کمال یوسف اور مصنف وغیرہ۔اس کے علاوہ کچھ ضمنی کردار بھی ہیں۔

کچھ عرصہ قبل دہلی میں ایک زنا کا واقعہ سامنے آیا تھا۔ جس پر پوری ہندوستانی عوام نے ایک ساتھ لبیک کہا تھا۔ جامعات میں طلبہ و طالبات کے ذریعہ احتجاج عمل میں آیا تھا۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ رام لیلا میدان میں اکھٹا ہو کر ظلم و جبر کے خلاف نعرے بلند کیے تھے۔ پردے میں رہنے والی عورتیں گلیوں اور سڑکوں پر اتر آئی تھیں۔اسی کڑی میں ناہید اور کمال نینی تال سے احتجاج کے لیے دہلی آئے ہوئے ہیں

۔احتجاج کئی دن چلتا ہے اور وہ مسلسل اس میں شریک ہوتے رہتے ہیں۔کمال بچے کی طبیعت سے پریشان ہوتا ہے،اس کی رائے ہے کہ انھیں گھر واپس چلے جانا چاہیے لیکن ناہید اس طرح احتجاج میں کھوگئی ہے کہ اسے خود کے بچے کا بھی خیال نہیں ہوتا ۔وہ اپنے احتجاج سے مظلومہ کو انصاف دلا کر واپس جانا چاہتی ہے۔اس کی نظر میں تمام مرد ظالم ہیں اور عورت مظلوم طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔چاہے وہ مرد اس کا باپ بھائی یا شوہر ہی کیوں نہ ہو۔اقتباس:

''کئی روز ہوگئے ۔ ہماری وجہ سے بچہ بیمار ہوسکتا ہے،

'ایک پوری نسل بیماری ہوچکی ہے۔' ناہید نے تیور سے کہا۔

'لیکن یہ ہمارا بچہ ہے۔'

'وہ بھی کسی کی بچی تھی۔'

'میں نے یہ تو نہیں کہا۔'

'تم نے یہی کہا۔ تم مردوں میں ہمارے معاملے میں ذرا بھی صبر نہیں —وہ غصہ میں تھی—

'پہلی بار ایک بڑی آواز ہماری حمایت میں اٹھی ہے تو تم اپنے قدم پیچھے کھینچ رہے ہو۔''۴؎

آہستہ آہستہ ناہید کا غصہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔اس کے دل میں مردوں کی خاطر ایک آگ سی پیدا ہوجاتی ہے۔وہ اپنی شرطوں پر جینے لگتی ہے۔ جو کچھ اسے اچھا لگتا ہے وہ اسے پورا کرنا چاہتی ہے۔وقتاً فوقتاً وہ اپنے شوہر سے عورتوں کی حرکات و سکنات اختیار کرنے کی ضد کرتی ہے ۔وہ اسے اپنے شوہر کی شکل میں قبول نہیں کرنا چاہتی۔وہ کہتی ہے،اقتباس:

''وہ شوہر نہیں ہے۔ خدا کے لیے انہیں شوہر نہ کہیے...... وہ میری بیوی ہیں......' ناہید نے کھلکھلا کر جواب دیا۔اور اب میری حراست میں ہیں۔''۵؎

دوسرے جانب کمال یوسف کو محبت کے جذبے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ناہید کی نازیبہ حرکات جو عام زندگی میں ایک مرد برداشت نہیں کرسکتا، وہ اسے بہ خوشی قبول کرتا ہے۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ناول نگار نے یہ بتانے کی کوشش میں ہے کہ ہر مرد عورت کو اذیت نہیں دیتا۔لیکن کچھ لوگ اسے صرف ایک نظر سے دیکھنا پسند کرتے ہیں جو ہمارے معاشرے کے لیے درست نہیں ہے۔

ناہید ناز اس عورت کی علامت ہے جو پوری دنیا کو بدل دینا چاہتی ہے ۔ وہ عورتوں کو مردوں کی ظلم و زیادتی سے آزاد کرانا چاہتی ہے۔جس جگہ بھی عورتوں کے تعلق سے غلط باتیں تحریر ہیں اس کے معنی و مطالب کو مردوں سے منسلک ہونا دیکھنا چاہتی ہے۔وہ نہیں چاہتی کی کسی بھی عورت کا نام سن کر کسی مرد کے ذہن میں گندے خیالات ابھریں۔جب کمال یوسف اسے ایک ڈکشنری کا پروجیکٹ دیتا ہے تو ایسے تمام الفاظ کے معنی و مطالب تبدیل کر دیتی ہے جن سے عورتوں کی عزت پر حرف آتا ہے۔ اقتباس:

''جیسے آوارہ......اس نے آوارہ کے آگے لکھا......

بدچلن مرد۔مردوں کے

چال چلن عام طور پر خراب ہوتے ہیں۔

فاحشہ......بدکار مرد......

حرام کار......بدکار مرد......

حرامی......بدذات مرد......

مطعون......بدنام زمانہ مرد......

طوائف......ناچنے گانے والا مرد......''۶؎

اس طرح کی تبدیلی ہمارے سماج میں رونما ہو رہی ہے۔لڑکیاں تعلیم کی طرف رجوع ہو رہی ہیں۔وہ اب کسی قید و بند کی زندگی نہیں گزارنا چاہتیں ، والدین کے اصولوں پر چلنے کے بجائے وہ اپنا راستہ خود بنانا چاہتی ہیں۔انھوں نے محبت اور ظلم میں فرق کرنا سیکھ لیا ہے ۔اور یہ معاشرے کے لیے ایک خوش آئند بات ہے۔آج کے والدین کو بھی چاہیے کہ لڑکوں اور

لڑکیوں میں کسی قسم کی تفریق نہ کریں بلکہ دونوں کو برابری کا حق دیں۔اگر لڑکا ڈاکٹر بن سکتا ہے تو لڑکی کیوں نہیں؟

ذوقی نے دو ایسے نسوانی کردار کو پیش کیا ہے جو ایک محبت اور دوسری نفر کی علامت ہے۔ایک بے پناہ محبت کرتی ہے اور دوسری مرد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ایک اس کی جدائی میں پاگل ہو جاتی ہے اور دوسری جدائی کے نام پر افسوس تک نہیں کرتی۔دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔یہاں شاید مصنف ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے کہ تمام تر تحریک نسواں کے باوجود ہمارے معاشرے میں ایسی لڑکیاں ہیں جو مردوں سے محبت کرتی ہیں۔ان پہلوؤں کی پیش نظر یہ بات بڑے اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ ناول نگار نے زندگی کی تمام تر حقیقتوں سے روبرو کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس گلوبل گاؤں میں ایک طرح کی اور تبدیلی آ رہی ہے جس میں چند لوگوں کو چھوڑ دیں تو لوگ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی وغیرہ سے زیادہ انسان بننے کی خواہش رکھتے ہیں۔ناول میں ایک اہم کردار ناگارجن اور ان کی بیوی کا ہے جو ایک ہندو خاندان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ایک مسلم لڑکی کو بڑی محبت کے ساتھ اپنی بیٹی بنا کر پناہ دیتے ہیں۔ایک مظلوم لڑکی کی حفاظت کے لیے ہندو یا مسلم ہونے کے بجائے ایک انسان ہونا کافی ہے۔جب انھیں یہ خبر ہوتی ہے کہ نو آمد لڑکی مسلم ہے تو اسے گھر سے بے دخل کرنے کے بجائے اس سے قرآن کی آئتیں سنتے ہیں۔جب کی دونوں میاں بیوی خیال سے مذہبی ہونے کے ساتھ ہر دن گیتا اور رامائن کا پاٹھ کرتے ہیں۔بدلتی تہذیب میں لوگوں کے نظریات تبدیل ہو رہے ہیں، دقیانوسی باتوں میں یقین رکھنا پسند نہیں کرتے۔اب کوئی سیاسی لیڈر آسانی سے مذہب کے نام پر لوگوں میں نااتفاقی یا بغاوت پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

متذکرہ بالا دلائل کی پیش نظر یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مشرف عالم ذوقی کا ناول 'نالۂ شب گیر' ایک بہترین معاشرتی اور تہذیبی ناول ہے۔جس طرح ہمارے معاشرے اور تہذیب وثقافت میں توازن باقی ہے اسی طرح ناول میں بھی اعتدال قایم رکھا گیا ہے۔'لے سانس بھی آہستہ' کی طرح یہ بھی ایک نیا اور اہم موضوع ہے جس سے اردو ادب کو ذوقی نے متعارف کرایا ہے۔

حواشی:

۱۔نالۂ شب گے، مشرف عالم ذوقی، ۱۶۰

۳۔ایضاً، ۲۳(۴)۔ایضاً، ۹۰(۵)۔ایضاً، ۸۲(۶)۔ایضاً، ۳۰۹

اقوال زریں

☆ جو لوگ میانہ روی اختیار کرتے ہیں، کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔" (نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

☆ جو علم کو دنیا کمانے کے لیے حاصل کرتا ہے علم اس کے قلب میں جگہ نہیں پاتا۔(امام ابوحنیفہ (رحمتہ اللہ علیہ)

☆ جب خلقت کے پاس آؤ تو زبان کی نگہداشت کرو (حضرت لقمان علیہ السلام)

☆ اللہ تعالی نے اشیاء کی حقیقت کا علم تم سے چھپالیا ہے، اس لیئے کوئی چیز تمہیں اچھی لگے یا نہ لگے، اس کے خلاف نہ کہو۔(شیخ عبدالقادر جیلانی)

☆ بعض اوقات اللہ کا بندے کی درخواست کو قبول نہ کرنا بندے پر شفقت کی وجہ سے ہوتا ہے۔(شیخ عبدالقادر جیلانی)

☆ دین کی اصل عقل، عقل کی اصل علم اور علم کی اصل صبر ہے، لہذا صبر کا دامن ہاتھ سے کبھی نہ چھوڑو۔(شیخ عبد القادر جیلانی)

ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ
اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ ڈگری کالج بوائز کپواڑہ کشمیر

سازشی تھیوری اور مسلمان

لفظ سازش اپنے اندر سحر کی طاقت رکھتا ہے جب ہم سازش کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کے اندر عمومی طور پر دو طرح کے رجحانات ہوتے ہیں۔ پہلا تہذیبی سازش اور دوسرا سیاسی سازش۔تہذیبی سازش میں ہم اکثر مخالف تہذیب یا مسلط تہذیب کو نشانہ بناتے ہیں ۔ ہمارے یہاں اکثر مخالف تہذیب میں مغربی تہذیب کو لیا جاتا ہے اس لیے ہم اس کو نشانہ بنانے کے لیے کسی بھی طرح کا واقعہ یا بیان جو اس کے منفی پہلو کی طرف اشارہ کرے اسے مثال بنا کر طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں اس کے برعکس جب ہم کہتے ہیں کہ ہماری تہذیب میں یہ یہ اچھائیاں ہیں تو ہمارے نزدیک عربی یا ایرانی تہذیب ہوتی ہیں جس کو ہم اپنی تہذیب کے طور پر لیتے ہیں یہی صورت حال تب ہوتی ہے جب ہم مشرقی تہذیب کہتے ہے تو ہمارے سامنے مشرق تہذیب سے مراد عربی یا ایرانی تہذیب ہوتی ہے جبکہ اسی مشرق تہذیب میں چین کی تہذیب بھی موجود ہیں لیکن ہم مذہبی تقدسیت میں عربی اور ایرانی تہذیب کو ہی مشرقی تہذیب سمجھتے ہیں اس لیے جب ہم کہتے ہیں ہماری تہذیب ہمارا معاشرہ تو اس ''ہماری'' سے مراد یہی دو تہذیبیں یا ان دونوں کے مشترکہ اختلاط سے بننے والی تہذیب جسکو ہند المانی تہذیب بھی کہتے ہیں مراد ہوتی ہے ۔جب ہم رشتوں کی تقدسیت، بے راہ روی، مذہب بیزاری، عقائد سے روگردانی وغیرہ کا رونا روتے ہیں تو ان سب کو مغربی تہذیب اور معاشرے سے جوڑتے ہیں، اسی طرح مسلم ممالک میں جو بے چینی، بے یقینی، خون خرابہ، تشدد بدامنی وغیرہ جیسے واقعات رونما ہو رہے ہیں اس کو بھی مغربی تہذیب کی سیاسی یا مذہبی سازش کہتے ہیں اور اگر بالفرض مغربی تہذیب یا سیاست میں کچھ اچھائیاں مل جاتی ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ اس کو انہوں نے ہماری تہذیب سے لیا ہے غرض ساری خرابیاں مغربی تہذیب میں اور ساری اچھائیاں ہماری (ایرانی و عربی) تہذیب میں نظر آتی ہیں۔ مذہب سے روگردانی، پرانی روایت سے بغاوت، اپنے سیاسی و معاشی نظام سے غیر مطمئن، کیا یہ سب مغربی تہذیب کی سیاسی سازش ہیں یا پھر حالات اور وقت کا بدلاو۔

تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے جس تہذیب کو ہم آج مسلم تہذیب کہتے ہیں اس تہذیب سے پہلے بھی دنیا میں بہت سی ترقی یافتہ تہذیبیں تھیں جن میں سمیری تہذیب، رومن تہذیب، بابل، ہڑپہ، مہنجو داڑو وغیرہ قابل ذکر ہیں ہر ترقی یافتہ تہذیب نے اپنے دور میں دوسری تہذیبوں کو متاثر کیا ہے اور ایسی ہی صورت حال مسلم تہذیب کو بھی پیش آئی اپنے عروج کے زمانے میں اس نے بھی دوسری تہذیبوں کو نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ دوسری تہذیبوں سے استفادہ بھی کیا ہے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ کسی بھی تہذیب خواہ وہ سیاسی ہو یا علمی اس کو جب بھی موقعہ ملا اس نے اپنی برتری کو ثابت کرنے کے لئے اپنے دور کے سیاسی، سماجی، لسانی، معاشی اور نفسیاتی عوامل کو متاثر کیا ہے یا ایسی ہی صورت حال دور حاضر میں ہمارے سامنے ہے، ہمیں جس تہذیب سے واسطہ پڑا ہے اس تہذیب کی گہری واقفیت کے ساتھ ساتھ ہمیں تہذیبی تاریخ کی بھی واقفیت ہونی چاہے اور یہ واقفیت سطحی نہ ہو بلکہ

گہرے فہم وادراک کے ساتھ گہری بصیریت ہونی چاہئے تا کہ اس صورت حال کا صحیح تجزیہ ہو سکے۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہم زوال کی کی طرف تیزی سے گامزن ہوئے۔ ہماری کیفیت بھی ایسی ہوگئی جیسے پاپائیت کے دور میں مغرب کی ہوئی تھی ہماری فکر ونظر میں خود ساختہ مذہب کو اسی طرح دخیل کیا گیا کہ فرد کا ذاتی فہم و ادراک جمود کا شکار ہوا اور ہم تقلید جامد بن کے رہ گئے۔ انسانی فکر ونظر کا ایسا دورانیہ قوموں کے لئے نہایت نازک ہوتا ہے اس دورانیہ میں اگر قوم کے اہل دانش نے تفکر اور تدبر سے کام لیں تو یہ کربناک صورت حال فکر کی مثبت راہوں کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں خیر الدین پاشا، جمال الدین افغانی، سرسید اور شبلی جیسے مدبروں نے ایسے دورانیہ میں فہم وادراک کے دریچوں کو کھولنے کی کوشش کی ان چاروں کی فکر کا مشترکہ رجحان آزادی اظہار تھا جس کی بازگشت بعد میں اقبال کے فلسفے میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ چناچہ اقبال اپنے خطبہ ''اسلام کے نظام میں حرکت کے اصول'' میں فرماتے ہیں:۔

''کسی قوم کی تقدیر کا انحصار اس بات پر نہیں کہ اسے کسی نہ کسی اصول کے تحت مستقل طور پر منظم رکھا جائے، بلکہ اس بات پر ہے کہ قوم کس قسم کے قابل اور طاقتور انفرادی شخصیتیں پیدا کر سکنے کی اہل ہے ایسے معاشرے میں جہاں محض تنظیم پر ہی زور دیا جائے فرد کی اہمیت کلی بور پر ختم ہوتی ہے فرد اپنے گردنواح کے معاشرتی فکر کی دولت تو حاصل کر لیتا ہے مگر وہ اپنی فطری اجتہادی روح گنوا بیٹھتا ہے پس اپنی گذشتہ تاریخ کا جھوٹا احترام اور اس کا مصنوعی احیاء کسی قوم کے زوال کو روک نہیں سکتا۔'' (ص۱۸۲، خطبات اقبال از جاوید اقبال)

جب کوئی طاقتور تہذیب زوال کی طرف گامزن ہوتی ہے تو اس کی جگہ نئی تہذیب لے لیتی ہے اس دورانیے میں زوال یافتہ تہذیب کی نفسیات میں شازشی تھیوریوں کی ایک نفسیات پیدا ہوتی ہے، جہاں وہ اپنے زوال اور خامیوں کو دوسری تہذیب یا مدمقابل تہذیب کا کہہ کر خود کی خامیوں سے چشم پوشی کرتی ہے۔ شازشیوں کی یہ تھیوریاں ان ذہنوں میں سرعت کے ساتھ پنپتی ہیں، جو سطحی اور جذباتی ہوں۔ جنہوں نے خود پسندی میں یہ خیال کیا ہو کہ ان کے اندر کوئی خامی موجود نہیں ہے چناچہ یہ تھیوریاں جن کو عام طور پر Canspairay Theory کہتے ہیں انسان یا سماج کو اپنی خامیوں کی طرف متوجہ ہونے سے غافل کر دیتی ہیں پھر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کا دھیان اپنی کمزوریوں کا تجزیہ کرنے اور ان کا مداوا کرنے کی طرف نہیں جاتا بلکہ وہ ہر وقت سازشیوں کا تانا بانا بننے اور اس پر سوچ وفکر کرنے میں اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے ماہرین نفسیات اس کیفیت کو Hellosenesiya کہتے ہے جو دراصل حقائق سے فرار اور شکوک وشبہات کے خیالات Paranoid Thinking کی دنیا میں زندہ رہنے کا نام ہے۔ ایسی نفسیات کا سماج یا فرد دوسرے سماج یا فرد کو شک و شبہے کی نظر سے دیکھتا ہے، اس کے خیال میں دوسرا فرد یا گروہ کسی بین الاقوامی یا دوسرے لفظوں میں کسی اغیار کی سازش کا آلہ کار ہوتا ہے اور وہ ہر کسی کو اسی خفیہ دشمن یا طاقت کا کارندہ یا ایجنٹ سمجھنے لگتا ہے جس کا نتیجہ ذہنی انتشار اور غلط تجزیہ کی صورت میں نکلتا ہے۔

بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی سوچ یہ ہے کہ اسلام اور مسلمان آج ایک سازش کی زد میں ہے جس کی منصوبہ بندی اغیار نے کمال ہنرمندی اور مہارت سے کی ہے اور ہم بحیثیت قوم آج جن داخلی اور خارجی مسائل کے شکار ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسی سازش کے مختلف مظاہر ہیں یہ فرقہ واریت، مساجد پر حملے، قتل عام، بدامنی، مذہبی انتہا پسندی یہ سب ہمارے دشمنوں کی سازش ہے اور ان سب کے پیچھے ہم کسی سی۔ائی۔اے، موساد، کے۔جی۔بی وغیرہ کا ہاتھ ڈھونڈتے ہیں اور اپنے الزام کے صحیح ہونے کے دلائل میں ان ہی اداروں

یا لوگوں کے بیانات، تحریریں، کتابیں وغیرہ کو پیش کرتے ہیں جن پر ہم یہ الزام لگا رہے ہوتے ہیں گویا ہم سازش کے اثبات میں ان کی صداقت کی گواہی دے رہے ہیں۔ایسی الزام تراشیاں نئی نہیں ہیں بلکہ گزشتہ دوصدیوں کا اگر غیر جانبداری سے تجزیہ کیا جائے تو بے شمار شواہد ایسے ملیں گے کہ ہم نے ایک دوسرے پر برطانوی، ایرانی، سعودی، یہودی، عیسائی یا ہندوؤں کے ایجنٹ کا الزام لگایا ہے۔آج بھی ہمارے صاحب عقل و دانش انہیں شازشی تھیوریوں کے اردگرد اپنے علم و ہنر کا استعمال کررہے ہیں، اوران الزام تراشیوں میں کتنی صداقت ہے اس سے قطع نظر اس نقطہ کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ اس سے بحیثیت قوم ہماری نفسیات پر کیا اثرات مرتب ہوئے یا ہورہے ہیں اور ان جیسے واقعات سے جڑی سازشی تھیوریوں پر غور کرنے کے بعد ہمارے سامنے جو چند سوالات کھڑے ہوتے ہیں۔مثلاً اگر واقعی ہر واقعہ اور حادثہ اغیار کی سازش کا نتیجہ ہے تو اس سے یہ معلوم پڑتا ہے کہ ہمارا دشمن اتنا طاقت ور اور ذہین ہے کہ واقعی ہم عملاً اس کے سامنے بے بسی کی تصویر بن چکے ہیں۔دنیا کی اعلیٰ عسکری طاقت اس کے پاس، تمام ذرائع ابلاغ کا کنٹرول اس کے پاس، وہ چاہے تو ہمیں کالا ثابت کریں چاہے تو گورا، بہ الفاظ دیگر وہ جس طرح سے چاہے دنیا کو ہماری شکل دکھا سکتا ہے ایسے میں ہمارے سامنے پھر دو ہی راستے دکھائی دیتے ہیں۔ایک ہمارے پاس جو کچھ طاقت ہے اس کو جمع کرنے کے بعد ان کے خلاف میدان کارزار میں اتاریں یا پھر دنیا کی سیاست سے لاتعلق ہوکر یہاں کی جدوجہد سے علاحدگی اختیار کریں۔ بحیثیت قوم ہم نے عموماً ان ہی دو راستوں کا انتخاب کیا ہے جو قومی تاریخ کا المیہ ہے۔قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں ہی رویے مایوسی کی انتہا کا بیانیہ ہوتے ہیں اوران کو اپنا کر مستقبل میں کوئی اچھا بدلاؤ نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ بحیثیت قوم مایوسی کی انتہا پر شک کی نفسیات میں مبتلا ہونا فطری بن جاتا ہیں جہاں سے پھر ہمارے اندر مثبت سوچ کی اور رہنمائی کے امکانات معدوم ہوتے جاتے ہیں۔

گزشتہ دوصدیوں سے لگا تار ہم نے ان ہی دو راستوں کا انتخاب کیا ہوا ہے میدان کارزار میں ہماری ہار کی تاریخ موجود ہیں وہ چاہے میسور ہو یا پلاسی، بالاکوٹ ہو یا دہلی، عثمانی سلطنت ہو یا پھر مغل، افغانستان ہو یا پھر عراق غرض ہر محاذ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ہم نے ہر بار غلط میدان کا انتخاب کیا اور ہر بار ہم نے اپنی خامیوں اور ناقص حکمت عملی کو اللہ کی آزمائش سے تعبیر کرتے ہوئے عزمت اور استقامت کا نعرہ بلند کیا جس سے اور زیادہ نقصانات ہمارا مقدر ٹھہرا۔ان حادثات سے سبق سیکھنے کے بجائے ہم نے پلٹ کر ان ہی میدانوں کا انتخاب کیا جبکہ مد مقابل ''یہ بازو ہے میرے آزمائے ہوئے'' کی شان سے کھڑا رہا، بے سروسامانی کے باوجود ان ہی میدانوں کے مشورے دیئے جاتے رہے ایسے میں اگر کسی نے غلط میدان کی اور اشارہ کیا تو اسے اغیار کا ایجنٹ کہہ کر اپنی خامیوں کو ان سازشی تھیوریوں میں گم کردیا۔

عزیزان علم و دانش تھوڑا سا غیر جذباتی ہوکر معروضی حقائق سے نظریں ملائیں ابتداء کے چھ سو سالوں میں جتنا علاقہ مسلمانوں نے فتح کیا تھا اس کا 75% آج بھی مسلمانوں کے پاس ہے لیکن اس کے باوجود بھی ہم کاسہ گدائی لیے ہوئے اغیار کی سازشوں کا رونا رو رہے ہیں اور اپنی پوری صلاحت کو Conspirary Theory کے نعروں میں لگا دیتے ہیں ایسے نعرے دراصل جذباتی ذہن کی پیداوار ہوتی ہے کیونکہ جب انسان یا گروہ کے پاس حالات بدلنے کی طاقت موجود نہ ہو لیکن وہ جلد از جلد کوئی نتیجہ دیکھنے کے لئے بیتاب ہوں تو اپنے ذہنوں کو مطمئن کرنے کے لئے وہ سازشی تھیوریوں کا سہارا لیتا ہے اور خود کو مطمئن کرنے کے لئے کہتا ہے چونکہ ہمارا مدمقابل کچھ خفیہ طاقتوں کے ساتھ ہے اس لیے ہم کامیاب نہیں ہورہے ہیں۔ابھی کل ہی کی بات ہے انگریزوں

کی وجہ سے ہندوستان ہیں جو حالات ہندی مسلمانوں کی تھی اس سے کہیں زیادہ ابتر حالات جرمن اور اس کے اتحادیوں کی وجہ سے یہودیوں کی تھی لیکن نصف صدی سے بھی کم عرصے میں بنا کسی عسکری مزاحمت بغیر پورے مغرب کے سیاسی اور معاشی منظر نامے کو انہوں نے بدل کر رکھ دیا ایسا کیوں؟ کیا ہندی مسلمانوں کے پاس سیاسی یا معاشی طاقت یہودیوں سے کم تھی ۔نہیں بلکہ ہماری معاشی اور سیاسی طاقت تو یہودیوں سے کئی گنا زیادہ تھی لیکن دونوں کا انجام ہمارے سامنے ہے۔

میری اس پوری بحث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شازشیں نہیں ہوتی ہیں بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی طاقتور قومیں، ملک وتہذیب کا نوے فیصد کام علی الاعلان کرتی ہیں اور باقی کا دس فیصد کام خفیہ بھی ہوتا ہے لیکن ہمارے تبصرے اور تجزیے، ہماری ذہنی صلاحیت، افرادی قوت کو ان ہی دس فیصد کے ارد گرد لگایا جاتا ہے جبکہ باقی نوے فیصد سے ہم نظریں چراتے نظر آتے ہیں۔ممبر ومحراب، قلم وقرطاس کا ہر زاویہ اور یہاں کا مقبول عام طریقہ یہ ہے کہ اپنی ساری کمزوریوں ،کوتاہیوں اور خامیوں کو اغیار کی سازش کا کہہ کر کندھوں سے بوجھ اتارنے کی کوشش کی جائے ہمارے یہاں ایسی فضاء بنائی گئی ہے کہ بحیثیت مجموعی ہمارا مزاج فریادی بن چکا ہے اور اس فریادی مزاج کے پیچھے ہم نے اپنی ساری کمزوریوں اور کوتاہیوں کو چھپا لیا ہے طرفہ تماشا یہ ہے کہ ہم بار بار ان لفظوں کا اعادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں سب سے اچھی قوم، خیرالامت، بہترین قوم، مہذب قوم وغیرہ جس کی وجہ سے ہم پر خود پسندی اتنی حاوی ہوچکی ہے کہ ہم نرگسیت کے شکار ہوچکے ہیں۔

سائنس نے اتنی ترقی کی ہے کہ پوری دنیا ہماری مٹھی میں سما چکی ہے اسی سائنس کے دو بنیادی اصول ہے پہلا Struggle for existance دوسرا Servival of the fittest اور ان دونوں اصولوں کا ماخذ یہ ہے کہ زندہ رہنے کے لئے مستقل جدوجہد کی ضرورت ہے کیونکہ وہی عزت کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے جو سب سے آگے بڑھ جائے گویا اگر ہم غلطیاں کریں گے یا سست بن جائیں گے تو دوسروں کے ساتھ ترقی کی دوڑ میں شریک نہیں ہوں گے اور دوسرا آگے بڑھ کر زندگی کے میدان پر قبضہ کرے گا ایسی صورت میں ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم دوسروں پر الزام لگائیں کیونکہ قانون قدرت ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بے زار کر دے
دے کر احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
موت کے آئینے میں دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے

اقبال

ارحم نوخیز اعظمی کا دورۂ ناسا کے لئے انتخاب

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد نے دی مبارکباد

ارحم نوخیز اعظمی فرزند پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی کا جو سری چیتنیا حیدرآباد (تلنگانہ) میں آٹھویں جماعت کے طالب علم ہیں ناسا کے دورہ کے لئے انتخاب عمل میں آیا ہے۔ارحم نوخیز اعظمی نے آسٹرونومیکل سوسائٹی آف انڈیا کو اپنی جانب سے تیار کردہ پروجیکٹ روانہ کیا تھا اور اس پروجیکٹ سے متاثر ہوتے ہوئے آسٹرونومیکل سوسائٹی آف انڈیا نے ان کو ناسا کا امریکہ مشاہدہ کروانے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ ماہ مئی کے دوران امریکہ روانہ ہوں گے جہاں وہ اپنے پراجکٹ کو پیش کرنے کے لئے ناسا میں خلائی سائنس کے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔اس موقعہ پر شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے چیرمین ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی اور ٹرسٹیوں نے ارحم اعظمی کو مبارکبادی دیتے ہوئے تابناک مستقبل کی دعائیں دیں اور نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے۔

شیخ الاسلام محمد انوار اللہ فاروقیؒ

بانی جامعہ نظامیہ

آمتہ الصبیحہ (فاضلہ) کشن باغ۔حیدرآباد

سورۃ ال عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **کلما دخل علیھا زکریا المحراب وجد عندھا رزقا قال یامریم انی لک ھٰذا قالت ھو من عند اللہ** (آل عمران-37) جب بھی زکریا (علیہ السلام) حضرت مریمؑ کے حجرے میں آتے تو ان کے پاس کھانے کی چیزیں پاتے، انہوں نے پوچھا، اے مریمؑ! یہ تیرے پاس کہاں سے آئے؟ انہوں نے کہا اللہ کے پاس سے۔ بے موسم پھل حضرت بی بی مریمؑ کے پاس آنا یہ ان کی کرامت ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بی بی مریمؑ اللہ کی ولیہ ہیں۔ روح جسم سے علحدہ ہونے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ: **ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات** : راہ خدا میں جو قتل کیے جاتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو۔ روح پر موت کا اثر نہیں ہوتا۔ روح جسم سے نکل جانے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ مومنین کی روح نورانی ہوتی ہے اپنے خالق کو پہچان لیتی ہے۔ اس لیے اہل سنت والجماعت کے نزدیک اولیاء سے ان کی کرامات کا ظہور ہوتا ہے۔ کرامات کی دو قسمیں ہے۔ ایک حسی، دوسری معنوی۔ عام لوگ حسی کرامات اور صاحب کرامات کو ولی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ معنوی کرامات خاص اہل اللہ میں موجود رہتی ہے۔ حضرت شیخ الاسلام بانی جامعہ نظامیہ کی زندگی میں کرامت معنوی کے ساتھ کرامات حسی کا ظہور ہوا۔

قطب دکن حضرت یحییٰ باشاہؒ ایک مرتبہ ذکر و اشغال میں مراقب تھے اچانک کھڑے ہوگئے اور ان کی آنکھوں میں آنسوں تھے۔ اپنے صاحبزداوں کو طلب فرمایا اور کہا کہ فوری معلوم کرو، مولانا انوار اللہ فاروقی کا مزاج کیسا ہے؟۔ ان دنوں مولانا کی علالت کا سلسلہ چل رہا تھا۔ صاحبزداوں نے عرض کیا ابھی اطلاع آئی کہ مولانا کا وصال ہو چکا ہے۔ پھر صاحبزداوں نے آپ سے وجہ معلوم فرمائی تو آپ نے فرمایا: ابھی میں مراقبہ میں تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ شہر کے سارے راستے اس طرح روک دیئے گئے ہیں جس طرح کبھی بادشاہ کی آمد پر روک دیئے جاتے ہیں۔ تمام ہجوم سڑکوں کے کنارے اس طرح کھڑا ہے جس طرح کسی بادشاہ کا انتظار ہے۔ میں ہجوم میں داخل ہوا اور دریافت کیا کہ تم لوگ کس کے انتظار میں کھڑے ہو تو جواب ملا کہ مولانا انوار اللہ صاحب کا وصال ہوگیا ہے اور جنازہ میں آقا دو جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری ہونے والی ہے۔ اس لیے ہم ﷺ کے استقبال کے لیے کھڑے ہیں۔ (بحوالہ بانی جامعہ نظامیہ کے علمی و روحانی واقعات)۔

بقیہ صفحہ (42) کا

الغرض میری رائے میں یہ کتاب ایک بے حد وقیع کام کی حیثیت رکھتی ہے جس کا علمی و ادبی حلقوں میں یقیناً خیر مقدم کیا جائے گا اور یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ اس موضوع پر آئندہ ہونے والی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کے لئے یہ کتاب ایک اہم حوالہ ثابت ہوگی۔ اس سے بڑھ کر کسی تصنیفی کاوش کی اور کیا خوبی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے آنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہو۔

اردو میڈیا سے جڑی ہوئیں شخصیات پر بہت کم لکھا گیا ہے یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو گی۔

الغرض میں اپنی اور تمام قارئین اردو ادب کی جانب سے ڈاکٹر غوثیہ بانو کو ایک بہترین اور کارآمد کتاب کی تصنیف پر مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ کتاب کو اس پتہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

شہر آشوب اسلام

علامہ شبلی نعمانی

حکومت پہ زوال آیا تو نام ونشاں کب تک
چراغِ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک کردیئے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جا چکا، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

یہ سب ہیں رقص بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیران کو دکھائے گا شہید نیم جاں کب تک

یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ ان کو سنائے گا یتیم ناتواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگیزیٔ طوفان بیداد وبلا تاکے؟
یہ لطف اندوزیٔ ہنگامہ آہ وفغاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

نگارستان خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خوں چکاں کب تک

یہ مانا گرمی محفل کے ساماں چاہئیں تم کو؟
دیکھائیں ہم تمہیں ہنگامۂ آہ وفغاں کب تک

یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک

عروس بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زرفشاں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام نشاں کب تک

زوال دولت عثماں، زوال شرع وملت ہے
عزیزو فکر فرزند وعیال وخانماں کب تک

خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں؟
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

پرستاران خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترام سجدہ گاہ قدسیاں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوس کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید گلبانگ اذاں کب تک

بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراق اسلامی
چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کب تک

کہیں اڑکر نہ دامان حرم کو بھی یہ چھو آئے
غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صیدافگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک

جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن وامان شام نجدو قیرواں کب تک

ڈاکٹر عبد الحنان رہبرؔ
مبارک پور

غزل

کون کہتا ہے کہ جنت کے لیے آتے ہیں
ہم تو بس تیری اطاعت کے لیے آتے ہیں
ہو کے بسمل تری آغوشِ مسیحائی میں
دل کے زخموں کی جراحت کے لیے آتے ہیں
آسماں والے جبینوں کو جھکا کر اپنی
کعبۂ دل کی زیارت کے لیے آتے ہیں
جادۂ عشق ومحبت کی فضاء میں دیکھو
اب پرندے بھی تلاوت کے لیے آتے ہیں
لیکے ہونٹوں پہ صداقت کے سروں کا سرگم
تیری گلیوں میں ریاضت کے لیے آتے ہیں
ہو کے قربان دل وجاں سے محبت کی قسم
اے وطن تیری حفاظت کے لیے آتے ہیں
گھر کی چوکھٹ نہ سنبھل پائی ہے اب تک جن سے
قوم کی اب وہ قیادت کے لیے آتے ہیں
آستینوں میں چھپا کر وہ چلے ہیں خنجر
من کے کالے ہیں رزالت کے لیے آتے ہیں
رخ پہ وہ ڈال کر یادوں کی نقاب الفت
مضمحل جاں کی عیادت کے لیے آتے ہیں
اے خریدارِ محبت ترے بازار میں ہم
قدر وقیمت کی ضمانت کے لیے آتے ہیں
جو بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھا دے رہبرؔ
ہم اسی اشکِ ندامت کے لیے آتے ہیں

جھانگیر قیاس، حیدرآباد

غزل

ہم میں کہاں ہے حوصلہ ان کو جواب دے سکیں
اتنا تو ہم میں ہے ہنر دل کی کتاب دے سکیں
ہم سے حساب زیست کا وہ پوچھتے ہیں بار بار
اب کیا بتائیں زیست کا ہم کیا حساب دے سکیں
حقدار ہر خطاب کے بے شک ہیں وہ یقین ہے
کوئی بتائے ان کو ہم کیا خطاب دے سکیں
اپنی خطاؤں کا ہمیں احسا ہے بہت مگر
رب سے اگر سوال ہو ہم کیا جواب دے سکیں
جب عہدِ پیری آگئی عہدِ شباب پھر کہاں
مشکل ہے اب قیاسؔ خود اپنا شباب دے سکیں

غزل

ہم اپنی زیست میں حق کی زبان رکھتے ہیں
خلوص پیار کا دل میں نشان رکھتے ہیں
ہمیشہ اپنی صداقت سے ہٹ نہیں سکتے
ہم اپنے آپ کو یوں کامران رکھتے ہیں
ہمارے کام میں ناکامیوں کا کام نہیں
ہم اپنے کام پہ ہر وقت دھیان رکھتے ہیں
پڑے جو وقت تو ہم کچل کے رکھ دیں گے
کچھ اس قسم کے بھی ہم مہربان رکھتے ہیں
ہمارا ذہن الگ ہے تو سوچ الگ ہے قیاسؔ
کہ سر پہ فکر کا اک آسمان رکھتے ہیں

ابوھریرہ (ای ٹی وی)

آئی پی ایل: کرکٹ، دولت اور شہرت کا سنگم

کرکٹ کا سب سے بڑا ایونٹ آئی پی ایل یعنی انڈین پریمئر لیگ ایک بار پھر پورے آب وتاب اور چکا چوند کے ساتھ شروع ہو چکا ہے۔اس بار آئی پی ایل کا نیا سیزن یعنی آئی پی ایل سیزن الیون ہے۔آئی پی ایل کا سیزن الیون پچھلے دس سیزن سے الگ اور دلچسپ ہے۔اس بار آئی پی ایل میں ٹیموں کا نیا رنگ روپ نظر آئے گا۔ کیونکہ ٹیموں کی اوور ہاؤلنگ ہوئی ہے۔یعنی ٹیمیں نئی مرتب ہوئی ہیں۔ آئی پی ایل کے ضابطے کے مطابق،فرنچائزی کو دس سال میں کھلاڑیوں کو برقرار رکھنے اور نئے کھلاڑی چُننے کا اختیار دیا گیا ہے۔ہر ٹیم میں نئے کھلاڑیوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔جلاوطنی کے بعد،چنئی اور راجستھان کی ٹیموں کی ٹورنامنٹ میں واپسی ہوئی ہے۔تو، پونے اور گجرات کی چھٹی ہوگئی ہے۔اسی طرح اگر کھلاڑیوں کی بات کریں تو اس سیزن میں جہاں کئی نئے کھلاڑیوں کو موقع ملا ہے۔تو وہیں کئی پرانے اور معروف کھلاڑیوں کے ہاتھ مایوسی لگی ہے۔ویسٹ انڈیز کے مایاناز سلامی بلے باز کرس گیل جیسے کھلاڑی پر فرنچائیزیز نے دلچسپی نہیں دکھائی۔خیر وہ آخر میں اپنے قد سے بہت کم بولی میں کنگس الیون پنجاب کا حصہ بنے۔اسی طرح کئی اور بڑے اور معروف کھلاڑیوں کو بھی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔آئی پی ایل میں فرنچائزیز نے نام کے ساتھ ساتھ نئے اور بھرتے کھلاڑیوں پر بھی بھروسہ جتایا۔

اس ٹورنامنٹ میں دنیا کا ہر کھلاڑی کھیلنا اور حصہ بننا چاہتا ہے۔

آئی پی ایل میں ٹورنامنٹ میں پیسوں کی افراط و بہتات ہے،قسمت راتوں رات بدلتی ہے اور کم آمیز کرکٹر بھی، چمکتا ستارہ بن جاتا ہے۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آئی پی ایل سے ہندوستانی کرکٹ کو بہت فائدہ ہوا ہے۔ نئے، جوجھارو اور محنتی کھلاڑیوں کی کھوج میں آئی پی ایل نے بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔خود آئی پی ایل کے موجودہ چیئرمین راجیو شکلا کہتے ہیں کہ اس لیگ کو لیکر مختلف سطحوں پر اگرچہ خدشات ظاہر کیے جاتے رہے ہوں لیکن آئی پی ایل نے ہندوستان کی ساکھ بڑھانیاور عالمی کرکٹ میں بی سی سی آئی کا دبدبہ بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔آئی پی ایل گزشتہ دس سال سے کامیابی سے چلا آرہا ہے اور اس سے خاص طور پر جونیئر کرکٹ نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔یا یوں کہا جائے کہ فٹ بال کے بعد ہندوستان نے آئی پی ایل کی شکل میں سب سے بڑی کھیلوں کی لیگ پیدا کی ہے۔ اس لیگ سے کھلاڑیوں کے علاوہ اور ملک کو بھی بڑا فائدہ ہو رہا ہے۔آج ٹیم انڈیا میں بھی کئی ایسے چہرے ہیں جو آئی پی ایل کی ہی دین ہیں۔یعنی آئی پی ایل نے ایسے گم نام کھلاڑیوں کو عزت وشہرت بخشی ہے۔ جو شاید آئی پی ایل کے بغیر ممکن نہیں تھی۔آئی پی ایل کی وجہ سے ہی ٹیم انڈیا اب دنیا کی دوسری مضبوط ٹیموں کی صفوں میں شامل ہوگئی ہے۔موجودہ وقت میں ٹیم انڈیا کے پاس گیند بازی۔ بلے بازی اور فیلڈنگ میں زبردست سدھار ہوا ہے۔اور ٹیم انڈیا میں بھی آسٹریلیا اور انگلینڈ کی طرح کرکٹ کے تمام فارمیٹ کے کھلاڑی موجود ہیں۔خیر یہ تو ہوئی بات آئی پی ایل کے فوائد کی۔لیکن اگر آئی پی ایل سیزن الیون کی بات کی جائے۔تو اس بار کا آئی پی ایل ٹورنامنٹ نئے جوش۔ کلیور اور نئے روپ رنگ کے ساتھ حاضر ہے۔ جہاں ہر ٹیم دوسری ٹیموں سے مضبوط اور بیس نظر آتی ہے۔ہر ٹیم کے پاس بہترین کھلاڑیوں کی لمبی فہرست ہے۔جس میں ہندوستان کے علاوہ دنیا کی نامی گرامی ٹیموں کے کھلاڑی شامل ہیں۔سب سے زیادہ کھلاڑی جنوبی افریقہ۔آسٹریلیا اور ویسٹ انڈیز سے ہیں۔ جہاں کے کھلاڑی کرکٹ کے شارٹ فارمیٹ میں ماہر مانے جاتے

ہیں۔اس کے علاوہ بنگلہ دیش۔افغانستان۔اور نیپال کے کھلاڑی بھی آئی پی ایل کا حصہ ہیں۔آئی پی ایل ٹورنامنٹ اس سال 7اپریل سیشروع ہوکر مئی تک چلے گا۔لیگ کوفکسنگ سے پاک صاف رکھنے کے لئے بھی آئی پی ایل انتظامیہ نے کمر کس لی ہے۔انتظامیہ نے بیٹنگ اور فکسنگ جیسے مسائل سے نمٹنے کے لئے سخت انتظامات کیے ہیں۔انتظامیہ کے مطابق آئی سی سی اور بی سی سی آئی کے انسداد بدعنوانی یونٹوں کوکھلاڑیوں کی نگرانی کے لئے رکھا گیا ہے۔ویسے بھی، بی سی سی آئی کے قوانین سخت ہیں اور اگر کوئی کھلاڑی قصوروار پایا جاتا ہے تو اسے سختی سے سزا دی جاتی رہی ہے۔تو وہیں۔آئی پی ایل2018 سے آمدنی کا ماڈل بھی تبدیل کر دیا گیا ہے اور اس میں فرنچائزز کا خاص خیال رکھا گیا ہے جنہیں آمدنی کا حصہ ملے گا۔ابھی تک فرنچائزیز کو لائسنس فیس دینی ہوتی تھی لیکن اب آمدنی ماڈل اسٹاک پر مبنی ہوگا اور فرنچائزیز کو بھی مرکزی آمدنی سے پیسہ ملے گا۔یعنی آئی پی ایل لیگ صرف کرکٹ کو بڑھاوا دینے کا ذریعہ نہیں ہے۔ بلکہ یہاں دولت۔شہرت۔عزت اور بے انتہا تفریح کا سامان موجود ہے۔

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد میں مناسب قیمت پر اشتہار کے ذریعہ اپنے کاروبار اور تجارت کو فروغ دیجئے

چھ ماہ مسلسل اشتہار پر ایک مہینہ مفت اور ایک سال اشتہار پر دو مہینہ مفت اشتہار شائع کیا جائے گا

سرورق پشت مکمل	ملٹی کلر	10000روپے
سرورق پشت نصف	ملٹی کلر	6000روپے
سرورق پشت چوتھائی	ملٹی کلر	4000روپے
سرورق اندرونی مکمل	ملٹی کلر	7000روپے
سرورق اندرونی نصف	ملٹی کلر	4000روپے
سرورق اندرونی چوتھائی	ملٹی کلر	2500روپے
اندرونی صفحہ مکمل	بلیک اینڈ وائٹ	2000روپے
اندرونی صفحہ نصف	بلیک اینڈ وائٹ	1500روپے
اندرونی صفحہ چوتھائی	بلیک اینڈ وائٹ	1000روپے
سرورق ایک انچ	ملٹی کلر	200روپے
اندرونی صفحہ ایک انچ	بلیک اینڈ وائٹ	100روپے

اشتہار کے لئے رابطہ کریں: **9392533661-8317692718**

پتہ آفس: مکان نمبر 17-6-352 سکینڈ فلور، بافنا کمپلکس، نزد آصفیہ مسجد، دبیر پورہ روڈ، پرانی حویلی، حیدرآباد تلنگانہ

شبلی کی صدا آفاقی ہے، جس میں قوم وملت کی دردمندی ٹپکتی ہے: پروفیسر مظفر علی شہ میری

ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کرنول میں ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد کا رسم اجرا

ڈاکٹر امت الرحیم، ڈاکٹر سلطان محی الدین، ڈاکٹر سراج احمد انصاری، ڈاکٹر عبدالقدوس، پروفیسر سید خطیب مصطفیٰ، ڈاکٹر مختار احمد فردین، پروفیسر مظفر علی شہ میری، ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی، حضرت رحمٰن جامؔی، ابوہریرہ (ای ٹی وی) ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر محمد شفیع، ڈاکٹر عبدالخالق ''صدائے شبلی کا رسم اجرکرتے ہوئے۔ دوسری تصویر میں پروفیسر مظفر علی شہ میری خطاب کرتے ہوئے۔

۱۲/مارچ ۲۰۱۸ء بروز پیر ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی اور شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کے اشتراک سے یونیورسٹی کے سیمینار ہال میں ایک ادبی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ نشست کو دوحصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے حصے میں قرآن کی تلاوت کے بعد جامعہ کے طلبہ وطالبات نے ترانہ پیش کیا۔ بعدازاں علامہ شبلی نعمانی کی حیات وخدمات کے موضوع پر تین مقالات پیش کئے گئے، جو دم بخود کردینے والے تھے۔ علاوہ ازیں پروجیکٹر کے ذریعہ اعظم گڑھ میں قائم کردہ شبلی کالج، دارالمصنفین، مرقدِ شبلی اور قوت تعلیم انٹرنیشنل کانفرنس کی تصویریں سامعین کے روبرو پیش کی گئیں اس نشست کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کی رجسٹرار محترمہ ڈاکٹر شاہدہ اختر انجام دے رہی تھیں۔

دوسری نشست میں شبلی انٹرنیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کی جانب سے جاری ہونے والا رسالہ ''صدائے شبلی'' کے اجرا کی رسم پوری کی گئی۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر مظفر علی شہ میری نے ٹرسٹ کے تمام اراکین کا شکریے کے ساتھ ایک علمی، ادبی، تحقیقی اور سماجی جریدے کی اشاعت پر مبارکباد پیش

کی اور سبھی مہمانوں کا مومنٹو کے ذریعہ خیر مقدم کیا۔آپ نے فرمایا کہ بحسن اتفاق، جس دن ٹرسٹ کا رجسٹریشن کیا گیا، میں کرنول آیا تھا۔اس لحاظ سے اردو یونیورسٹی اور شبلی ٹرسٹ دونوں ایک عمر کی دہلیز پر ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اس نا اتفاقی اور اختلافات کے دور میں میں ایک پیغام محبت، محنت اور خدمت کو عام کرنا چاہتا ہوں، جس کی نہ صرف طلبہ وطالبات نے تائید کی ہے بلکہ جامعہ کے 'لوگو' میں بھی رقم کیا گیا ہے۔انہوں نے اس موقع پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے لیے تاریخی موقع ہے کہ علامہ شبلی جیسے ادیب کے نام سے شائع ہونے والے ادبی جریدے کا رسم اجرا، ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی میں کیا جارہا ہے۔شبلی کی صدا، آفاقی ہے، جس میں قوم وملت کی دردمندی ٹپکتی ہے۔علاوہ ازیں ڈاکٹر سراج احمد انصاری کی پہلی تصنیف ''مضرابِ نقد'' اور ڈاکٹر مختار احمد فردین کی پانچویں کتاب ''قلمی سفر'' کی رونمائی بھی شیخ الجامعہ کے ہی ہاتھوں تکمیل پائی۔

ڈاکٹر مختار احمد فردین صدر آل انڈیا اردو ماس سوسائٹی فار پیس کی جانب سے استاذ الاساتذہ حضرت رحمان جامی کو شیخ الجامعہ پروفیسر مظفر علی شہ میری صاحب کے ہاتھوں اردو تاج رتن ایوارڈ سے نوازا گیا۔ڈاکٹر فردین نے ڈاکٹر اے پی جی عبدالکلام کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اگر عزائم محکم ہوں اور سبھی لوگ متحد ہوکر کام کریں تو بلندیوں کی چوٹیوں پر پہنچنا آسان ہوجاتا ہے۔رسالے کے مدیر ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں میزبان اور مہمان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ معاشرے کو اس وقت ایسی شخصیات کی ضرورت ہے جو نہ صرف لائق و فائق ہوں بلکہ تعمیری ذہن بھی رکھتی ہوں۔صدر محفل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ ایک ایسے استاد ہیں جو رجال ساز اور مصنف گر ہیں۔ادارے کی اور مجھ ناچیز کی خوش نصیبی ہے کہ ہم لوگوں کو ایک ایسے اعلی ظرف استاد کی رہنمائی نصیب ہوئی ہے جو محبت اور محنت وعمل کا علمبردار ہے۔انہوں نے تمام سامعین کا استقبال کرتے ہوئے اسٹیج پر تشریف فرما حضرت رحمٰن جامی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ابوہریرہ (ای ٹی وی) پروفیسر سید خطیب مصطفیٰ سابق صدر شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ڈاکٹر عبدالقدوس، ڈاکٹر حمران احمد اور ڈاکٹر سراج احمد انصاری کے علاوہ ڈاکٹر شاہد اختر، ڈاکٹر محمد شفیع، ڈاکٹر عبدالخالق اور دیگر خصوصی مہمانان کا فرداً فرداً استقبال اور شکریہ ادا کیا۔بعد ازاں ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب نے ادارے کی کارکردگی اور ادبی ومعاشرتی سرگرمیوں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔انہوں نے بتایا کہ ۲۷/اکتوبر ۲۰۱۶ء میں ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی اور چند ساتھیوں نے ایک تنظیم قائم کی اور اسے علامہ شبلی نعمانی سے معنون کیا۔ایک سال اور چند مہینوں کی قلیل مدت کے باوجود ادارے نے چند اہم کام انجام دیے ہیں۔اعظم گڑھ میں ایک انٹرنیشنل سیمینار بعنوان ''قوت تعلیم انٹرنیشنل کانفرنس''۔حیدرآباد میں 'اردو زبان وادب اور نئی نسل'، ''ایک شام شبلی کے نام'' اور دیگر ادبی جلسوں کے علاوہ شاہین نگر میں غریب بچوں کی خاطر مذہبی اور جدید تعلیم سے آراستہ ایک مدرسے کا قیام اور اب شبلی سے موسوم جریدہ ''صدائے شبلی'' کا اجرا اسی کا حصہ ہیں۔بعد ازاں ای ٹی وی کے اینکر ابوہریرہ نے رسالے کے مدیر اور تمام اراکین کو پرنٹ میڈیا میں ایک اہم اضافے پر دلی مبارک باد پیش کی۔علاوہ ازیں طلبہ وطالبات کے درمیان ان سے اردو خبروں کے متعلق دلچسپی جاننے کی کوشش کی۔جس میں بچوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔آخر میں حضرت رحمٰن جامی نے شیخ الجامعہ پر لکھے اپنے قطعات پیش کئے۔جس میں ان کی خدمت خلق، ادبی حیثیت، شہرت اور مقبولیت کا اعتراف تھا۔شکریے کی باضابطہ رسم ڈاکٹر سلطان محی الدین، صدر شعبہ اردو، ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی نے ادا کی اور نظامت کی ذمہ داری ڈاکٹر سراج احمد انصاری نے بحسن وخوبی انجام دی۔

”منظورالامین۔نباض فکروفن“

مصنفہ: ڈاکٹرغوثیہ بانو

مبصر: **ڈاکٹر سمیہ تمکین**

اکیڈمک اسوسیئٹ اردو ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی

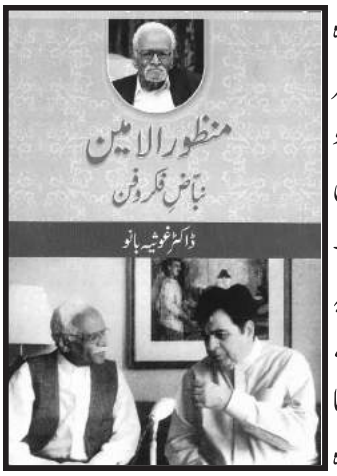

زیر تبصرہ کتاب دراصل ڈاکٹر غوثیہ بانو کی تلاش و جستجو اور محققانہ عرق ریزیوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ کتاب مصنفہ کے گہرے مطالعہ کا ماحصل ہے۔جو سادہ وسلیس لیکن معیاری زبان میں موجود ہے۔ادبی زبان میں عموماً ایک مفروضہ قائم کیا جاتا ہے لیکن اکثر اوقات ریسرچ اسکالر نتائج اخذ کرنے میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں مگر ڈاکٹر غوثیہ بانو نے اپنی گراں قدر معلومات سے بہترین نتائج اخذ کئے۔

زیر تبصرہ کتاب بلا شبہ قارئین سے سنجیدہ مطالعہ کی متقاضی ہے۔یوں بھی منظورالامین کی فکری بصیرت اور تنقیدی شعور نے اس کتاب کو قابل مطالعہ بنا دیا ہے۔اس کتاب میں جو موضوع تنوع اور اسلوب کی تازگی ہے وہ پر تاثیر اور دیرپا ہے ۔یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس کے زیر اہتمام نہایت عمدگی کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔سرورق پر منظورالامین اور یوسف خان کی جو تصویر چھپی ہے وہ معنی خیز بھی ہے اور دیدہ زیب بھی۔نفیس کاغذ پر طبع شدہ زیر تبصرہ کتاب ۲۱۹ صفحات پر مشتمل ہیں۔جس کے پہلے باب میں منظورالامین کے حالات زندگی ،شخصیت اور ماحول پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔باب دوم میں منظورالامین کی علمی خدمات پر بحث کی گئی ہے۔باب سوم میں موصوف کی ادبی خدمات کا بھرپور اور پر تاثیر تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ منظورالامین اردو بستی کے ایک اہم نقاد،ادیب اور صاحب طرز ادیب ہی نہیں بلکہ اردو شعر و ادب کے حوالے سے ایک متجسس شخصیت کے حامل ہیں۔باب چہارم میں منظورالامین کی میڈیائی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔آخر میں اختتامیہ کے عنوان سے نئے نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔

حیدرآباد میں مقیم اردو دنیا کے مایہ ناز ادیب، دانشور ،محقق،نقاد اور منفرد لب ولہجہ کے حامل محترم منظورالامین کا نام علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا کے شعبہ میں عرصہ دراز تک خدمات انجام دینے والی شخصیت جانی پہچانی ہے۔آپ نے علمی و ادبی کاوشوں کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دی ہیں وہ تادیر یاد رکھے جائیں گے۔اردو زبان و ادب میں آپ کی خدمات ناقابل فراموش رہی ہیں۔ منظورالامین نے کئی ایک کتابیں تصنیف کئیں جن میں ”بدلتے رشتے“،”جلیں آتش کدے“،”حدیث دل“اور”ٹیلی ویژن“(دنیا کا آٹھواں عجوبہ) قابل ذکر ہیں۔

منظورالامین پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔آپ ہمہ جہت فنکار اور تخلیقی صلاحیتوں کے حامل تھے۔منظورالامین کے انتقال سے اردو دنیا کا ایک عظیم نقصان ہوا ہے۔اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔آمین

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا،اس لئے مصنفین ،مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دو عدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔(ادارہ)

زیر تبصرہ کتاب ''منظورالامین۔نباض فکروفن'' چار ابواب پر مشتمل ہے۔باب اول کے تحت مصنفہ غوثیہ بانو نے موصوف کی حالات زندگی اور شخصیت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔اس باب کے تحت مصنفہ نے منظورالامین کا نام' جائے پیدائش' ولدیت' حسب ونسب' ابتدائی تعلیم' اعلی تعلیم' شادی بیاہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ موصوف کے بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی تفصیل بھی درج کی و نیز ان کے مشاغل' کھیل کود' لسانی واقفیت' سفر' اور تصانیف پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے انعامات واعزازات اور ملازمتوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

باب دوم میں منظورالامین کی علمی خدمات کے تحت' ڈاکٹر غوثیہ بانو نے علم کا مفہوم بیان کرتے ہوئے اس کی اہمیت سے واقف کرایا ہے۔اس اہم باب میں مصنفہ نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ منظورالامین کی تخلیقات میں معلومات کا خزانہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔نئی نئی معلومات ان کی تحریروں کا لازمی جز ہے جو کسی بھی علم میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔مصنفہ ڈاکٹر غوثیہ بانو قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس باب کے تحت منظورالامین سے جڑے ہر ایک گوشہ کو نہ صرف اجاگر کرنے کی کوشش کی بلکہ دلیلوں کے ذریعہ واضح کیا۔

اسکے علاوہ مصنفہ نے قاری کو ایک اہم نکتہ کی طرف متوجہ کیا کہ منظورالامین نہ صرف ایک بہترین ترجمہ نگار ہیں بلکہ انہوں نے اردو کو دیگر زبانوں سے واقف کرانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔یعنی کہ آپ نے انگریزی' فارسی' مراٹھی اور تلگو زبان سے ترجمہ کرتے ہوئے اردو داں طبقہ کو دیگر زبانوں سے روشناس کروایا۔

زیر تبصرہ کتاب کے تیسرے باب میں ڈاکٹر غوثیہ بانو نے منظورالامین کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف کہ سفرناموں' انشائیہ نگاری' مضامین اور بالخصوص ان کے اسلوب بیان کی اہمیت کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔منظور الامین کے اسلوب کی خاص پہچان ان کی بامحاورہ زبان ہے جس سے زبان پر ان کی قدرت کا احساس ہوتا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنی تحریروں میں تشبیہ واستعارہ کا استعمال بھی نہایت شد و مد کے ساتھ کیا ہے۔ان کے یہاں صنعت لفظی و معنوی کا استعمال نثر میں ملتا ہے۔ونیز ان کی تحریروں میں صنعت تجنیس' صنعت حسن وتعلیل اور صنعت ایہام وغیرہ کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔یہاں پر مصنفہ ڈاکٹر غوثیہ بانو کی عرق ریزی کا پتہ چلتا ہے۔عموماً یہ صنعتیں ہمیں شاعری میں بآسانی نظر آتی ہیں لیکن نثر میں اس کا استعمال شاعری کے مقابلے کم ہوتا ہے۔لہذا اس اہم نکتہ کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے مصنفہ نے منظورالامین کی اس اہم خوبی کی طرف قاری کو متوجہ کیا ہے۔اس باب کو مصنفہ نے دو حصوں میں منقسم کیا۔پہلا حصہ نثر پر مبنی ہے اور دوسرا شاعری پر۔منظورالامین کی شاعرانہ خصوصیت کے بارے میں مصنفہ لکھتی ہیں:

''ان کے یہاں برجستہ اور برمحل اشعار کا استعمال ملتا ہے جو ان کے شعری ذوق کا ثبوت فراہم کرتا ہے''

اس کے باوصف ڈاکٹر غوثیہ بانو نے منظورالامین کی شاعری کو علم بیان کے تحت سمجھانے کی کوشش کی ہے جس میں تشبیہ' استعارہ' اور علامت نگاری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا آخری باب منظورالامین کی میڈیائی خدمات پر منحصر ہے۔اس دور کو موصوف کے سنہرے دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔اس باب میں مصنفہ نے منظورالامین کی ریڈیو اور ٹی۔وی سے جڑے ہر ایک نکتہ کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ڈاکٹر غوثیہ بانو کے مطابق منظورالامین کی علمی وادبی خدمات کے پیش نظر یہ رائے قائم کرنے میں کوئی دشواری نہیں کہ منظورالامین اپنی گوناگوں علمی' ادبی اور میڈیائی خدمات کے تحت اردو شعروادب اور بالخصوص جنوب کے شعروادب میں اپنی جگہ بنائی ہے جو کہ بالکل درست ہے۔

بقیہ صفحہ (34) پر